جانم جانِ جہاں
علیم الحق حقی
copied from web

حُسن وجمال کی دولت بھی انسان کو اکثر ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیتی ہے۔

ایسی ہی ایک فتنہ ساماں حسینہ کے قتل کا ماجرا ____

وہ اپنے شوہر کو نظر انداز کر کے ساری دُنیا کو اپنی

زلفوں کا اسیر بنانے پر تلی ہوئی تھی ____ کہ اچانک

اس کی موت نے ایک نئے قضیے کی بنیاد رکھ دی۔ وہ

اس کے قتل کے الزام میں اس کا شوہر جیل کی سلاخوں

کے پیچھے پہنچ گیا۔ ایک قابل وکیل کا خیال تھا کہ وہ

بے قصور ہے۔

حُسن کی فتنہ سامانیوں، جرم کی نیرنگیوں، قانونی پیچیدگیوں اور

انسانی نفسیات سے عبارت یہ داستانِ ہوش رُبا چشم کُشا بھی ہے

اور عبرت آثار بھی۔

ایک مقدمے کی روداد جس پر ایک خاتون وکیل کے پورے کیریئر کا دارومدار تھا۔

جانم جانِ جہاں

علیم الحق حقی

مکتبہ القریش سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۔ ۲

باراوّل ——— 2001ء
ناشر ——— محمد علی قریشی
مطبع ——— نیر اسد پریس لاہور
کمپوزنگ ——— وسیم احمد قریشی
سرورق ——— ذاکر
قیمت ——— -/90 روپے
مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور

اکثر و بیشتر وہ نازنین کے تصور کو اپنے ذہن سے دھکیلنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس حد تک جو کسی انسان کے امکان میں ہو سکتی ہے۔ کبھی اسے اس حد تک کامیابی ہوتی کہ چند گھنٹوں کے لیے سہی' اسے سکون میسر آ جاتا۔ کبھی اسے پوری رات کی نیند بھی نصیب ہو جاتی۔ یہ واحد طریقہ تھا' جس سے اس کا کام چل سکتا تھا......کام......زندہ رہنے کا...... جینے کا کام!

وہ سوچتا کہ کیا اب بھی وہ اس سے محبت کرتا ہے......یا نفرت......؟ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ وہ بڑی بڑی روشن چراغوں کی سی حسین آنکھیں' تمسخر کرتی مغرور آنکھیں اور گھٹاؤں جیسے سیاہ بال اور وہ ہونٹ' جن کا پیرایہ اظہار بہت تیزی سے بدلتا تھا۔ ایک لمحہ میں وہ ترغیب دینے والے انداز میں مسکراتے تو دوسرے لمحے میں وہ ناراضی میں سکوڑ دیئے جاتے۔ اس بچے کی طرح' جس سے اس کی کوئی بے حد من پسند چیز چھین لی گئی ہو۔

اور اب......تقریباً گیارہ سال بعد سفینہ انصار گڑے مردے اکھاڑنے پر تل گئی ہے۔ وہ نازنین کو مرنے کے بعد بھی سکون سے نہیں رہنے دے گی۔ سوالات' سوالات اور سوالات ہی سوالات۔ نہیں......یہ تو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مداخلت ناقابل معافی ہے۔ اسے روکنا ہو گا۔ اسے روکنا ہے۔ اس نے سوچا......اور میں اسے روک دوں گا......خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ کچھ بھی کرنا پڑے۔ کچھ بھی!

☆☆☆

سفینہ انصار کے لیے وہ دن ہی بھاگ دوڑ کا تھا۔ عدالت میں اعصاب شکن وقت گزارنے کے بعد ڈھائی بجے وہ کورٹ ہاؤس سے نکلی۔ اس نے طوبیٰ کو سکول سے لیا۔ ڈاکٹر سلمان کا اپائنٹمنٹ چار بجے کا تھا مگر سڑکوں پر بے پناہ رش کی وجہ سے

گاڑی کو بار بار روکنا پڑتا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ وہ بروقت ڈاکٹر تک پہنچ گئی۔

اور اب اتنی بھگدڑ کے بعد اسے بیٹھ کر صرف انتظار کرنا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ طوبیٰ کے ٹانکے کھلیں تو وہ اس کے پاس ہو لیکن نرس نے اس کی ایک نہ سنی "ڈاکٹر مریض کے ساتھ آنے والے کسی شخص کو بھی یہ اجازت نہیں دیتے۔" اس نے کہا "نرس کے سوا کوئی کمرے میں نہیں جا سکتا۔"

"لیکن طوبیٰ تو بچی ہے۔ آٹھ سال کی بچی!" سفینہ نے بے سود احتجاج کیا۔

مگر سفینہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ حادثے کے فوراً بعد طوبیٰ کو ڈاکٹر سلمان تک پہنچا دیا گیا۔ ہسپتال کی نرسوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ڈاکٹر سلمان سے بہتر پلاسٹک سرجن ملک میں کوئی اور نہیں ہے۔

ایک ہفتہ پہلے کے اس دن کے بارے میں سوچتے ہوئے سفینہ کو احساس ہوا کہ اس فون کال کے صدمے سے وہ اب تک پوری طرح نہیں سنبھل سکی ہے۔ اس وقت وہ کورٹ ہاؤس میں تھی اور قتل کے ایک کیس پر کام کر رہی تھی' جو عدالت میں پیش کیا جانے والا تھا۔ اسے زیادہ دیر کام کرنے کی مہلت اس لیے بھی مل گئی کہ طوبیٰ کے باپ' اس کے سابقہ شوہر وقاص مرزا نے غیر متوقع طور پر طوبیٰ کو چند گھنٹوں کے لیے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔

ساڑھے چھ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف وقاص تھا۔ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا ہے۔ ونڈ شیلڈ کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے طوبیٰ کا چہرہ زخمی ہو گیا ہے۔ طوبیٰ سنٹرل ہسپتال میں تھی اور ہسپتال والوں نے پلاسٹک سرجن کو طلب کر لیا تھا۔ ویسے وہ ٹھیک ٹھاک تھی۔

فون ریسیو کرتے ہی وہ ہسپتال کی طرف لپکی۔ تمام راستے وہ طوبیٰ کی خیر و عافیت کے لیے دعا کرتی رہی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ زندگی نے طوبیٰ کے سوا اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں رہنے دیا تھا۔ اے اللہ...... میری بچی کو اپنی امان میں رکھنا۔

وہ ہسپتال پہنچی تو طوبیٰ سرجری میں تھی۔ چنانچہ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھی رہی۔ وقاص بھی وہیں موجود تھا۔ وقاص نے اسے طلاق دینے کے بعد دوسری شادی کر لی

تھی۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔

پھر ڈاکٹر سلمان باہر آیا۔ اس نے بے حد روکھے اور سرد لہجے میں بتایا کہ خراشیں گہری نہیں ہیں۔ بچی کے چہرے پر کوئی نشان نہیں پڑے گا "آپ ایسا کریں کہ ایک ہفتے بعد اسے میرے پاس لے آئیں۔" اس نے کہا۔

وہ کئی گھنٹوں کی پریشانی کے بعد اس کے لیے سکون کا پہلا لمحہ تھا۔ چہرے پر خراشوں کے سوا طوبیٰ کو کوئی زخم نہیں لگا تھا۔ سکول کی بس دو دن کی چھٹی ہوئی اور آج وہ طوبیٰ کو ڈاکٹر سلمان کے پاس لائی تھی۔

طوبیٰ بہت خوبصورت بچی تھی...... اپنے باپ کا عکس۔ اسے اس بات کی بہت فکر تھی کہ اس کا چہرہ خراب نہ ہو جائے۔ وہ بچی کو پورے ہفتے یقین دلاتی رہی تھی کہ ایسا نہیں ہو گا۔

ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ کمرے میں اور مریض بھی تھے' جو اپنی باری کے منتظر تھے۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ طوبیٰ کو اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟

بالآخر ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سفینہ نے متوقع نظریں اٹھا کر دیکھا لیکن طوبیٰ کے بجائے اسے ایک جوان اور خوبصورت عورت کمرے سے نکلتی نظر آئی سفینہ نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے نقوش کا جائزہ لے رہی تھی۔ عورت کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ ہو گی۔ گہرے سیاہ بالوں نے اس کی اجلی رنگت کو اور اجاگر کر دیا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں' محراب جیسی بھویں اور بھرے بھرے ہونٹ! اس کے چہرے کا ایک ایک نقش ترشا ہوا تھا۔

سفینہ کو اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ وہ اس عورت کو جانتی تھی...... لیکن کیسے؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے نرس سے پوچھا لیکن وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ بابرا ذیشان کا نام اس کے لیے نیا ہے۔ شاید اسے غلط فہمی ہو رہی ہے لیکن ذہن اپنی بات پر مصر تھا۔ اس نے اس عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ وہ سوچتی اور الجھتی رہی۔

☆☆☆

صالحہ وہاب کو ڈاکٹر سلمان کے ساتھ سرجیکل نرس کی حیثیت سے کام کرتے چار سال ہو چکے تھے۔ وہ اپنے دفتر میں جو آپریشن کرتا تھا' وہ ان میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ ڈاکٹر سے بہت متاثر تھی۔ وہ یقیناً جینیس تھا لیکن کبھی کبھی وہ سوچتی کہ نجانے کیوں وہ اب تک اس کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سلمان کا رویہ صرف اپنے سٹاف کے ساتھ ہی نہیں' مریضوں کے ساتھ بھی سرد مہری کا ہوتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو وہ بہت سخت ہو جاتا تھا اور اب پچھلے عرصے سے اس کی بدمزاجی اور چڑچڑے پن میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ غصہ ور ہو گیا تھا۔ اس کے اہانت آمیز رویے کی وجہ سے اس کے مریضوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ ہاں وہ اپنے ان مریضوں پر بہت مہربان رہتا تھا' جنہیں وہ ''خصوصی چہرہ'' دیتا تھا اور یہ خصوصی چہرہ صالحہ کے لیے زیادہ پریشان کن تھا۔

صالحہ نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈاکٹر خصوصی چہرے والی تازہ ترین مریضہ بابرا ذیشان کا معائنہ کر چکا تھا اور اب اندرونی کمرے میں تھا۔ صالحہ پریشان ہونے لگی۔ اب وہ اندر کیا کر رہا ہے۔ اسے اس بچی طوبیٰ کو بھی دیکھنا ہے' جو باہر آدھے گھنٹے سے اپنی باری کی منتظر ہے لیکن صالحہ جانتی تھی کہ خصوصی چہرے والے مریضوں کے معائنے کے بعد ڈاکٹر کو کچھ دیر کے لیے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

''مس وہاب!''

صالحہ چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈاکٹر سلمان قریب ہی کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

''میرا خیال ہے' ہم نے اس بچی طوبیٰ وقاص کو بہت انتظار کرا دیا ہے۔'' ڈاکٹر نے الزام دینے والے انداز میں کہا ''اب اسے بلا بھی لو۔''

صالحہ نے دیکھا۔ چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی ڈاکٹر کی آنکھوں میں برف جیسی سرد مہری تھی۔

☆☆☆

واپسی کے سفر میں طوبیٰ نے سفینہ سے کہا'' مجھے ڈاکٹر انکل اچھے نہیں لگتے۔''
سفینہ نے اسے غور سے دیکھا'' کیوں بھئی؟''

''مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ دیکھیں' ڈاکٹر ندیم ہمیشہ مجھ سے ہنستے بولتے ہیں' مذاق کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر سلمان کبھی مسکراتے بھی نہیں اور آج تو لگتا تھا کہ انہیں مجھ پر غصہ آ رہا ہے۔ وہ کہنے لگے...... '' طوبیٰ نے ڈاکٹر کی آواز اور لہجے کی نقل کی۔
''کچھ لوگوں کو خدا بے حساب حسن دیتا ہے اور کچھ کو اسے حاصل کرنے کے لیے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے لیکن کچھ بھی ہو' خوب صورتی کو ضائع بالکل نہیں ہونا چاہیے۔''

سفینہ سوچ میں پڑ گئی۔ طوبیٰ بلاشبہ خوبصورت بچی تھی لیکن کوئی ڈاکٹر اس سے اس طرح کی گفتگو کیوں کرے گا۔

''میں نے غلطی سے انہیں بتا دیا کہ جس وقت ایکسیڈنٹ ہوا' میں سیٹ بیلٹ باندھ رہی تھی۔ بس پھر انہوں نے مجھے لیکچر دینا شروع کر دیا۔'' طوبیٰ بولی۔

سفینہ جانتی تھی کہ طوبیٰ ہمیشہ کار میں بیٹھتے ہی سیٹ بیلٹ کستی ہے۔ اس نے اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''شاید تمہارے ڈیڈی کو اس روز کچھ زیادہ ہی جلدی تھی کہ انہوں نے تمہیں سیٹ بیلٹ کسنے کا موقع نہیں دیا۔''

''نہیں ممی' مجھ سے بکل لگ نہیں رہا تھا۔ ڈیڈی سمجھے کہ لگ چکا ہے۔'' طوبیٰ نے جلدی سے باپ کی صفائی پیش کی۔

سفینہ کو اپنی بچی پر پیار بھی آیا اور ترس بھی۔ وقاص نے اسے طلاق دی تو طوبیٰ چھوٹی سی تھی...... تین سال کی بچی اور وہ باپ کی دیوانی تھی۔ وقاص جب بھی بچی سے ملتا' اسے جتاتا کہ وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ اپنے دوسرے بچوں پر جان چھڑکتا تھا۔ دوسری بیوی سے اس کے دو بچے تھے۔ چار سال کی بیٹی اور دو سال کا بیٹا۔ وہ طوبیٰ کو اکثر مایوس کرتا تھا۔ وعدہ کرتا اور بھول جاتا۔ صرف اس لیے کہ اس کی دوسری بیوی کو اس کا طوبیٰ سے ملنا پسند نہیں تھا۔

اور کبھی وہ آتا اور طوبیٰ کو اپنے ساتھ لے جاتا تو...... سفینہ کو حادثہ یاد آیا اور اسے پھر غصہ آنے لگا مگر اس کا اظہار اسے اچھا نہیں لگا۔ اس نے بچی سے کہا ''چھوڑو ان باتوں کو تم نانا اور نانی کی باتیں کرو۔''

''مجھے یقین ہے' وہ آج مجھے کوئی تحفہ ضرور دیں گے۔'' طوبیٰ نے خوش ہو کر

کہا۔

☆☆☆

شاہ زیب اکبر اور تمکنت رات کے کھانے پر سفینہ اور طوبیٰ کے منتظر تھے۔ دونوں کی عمریں ساٹھ سے اوپر تھیں اور ان کی ازدواجی زندگی چالیس برسوں پر محیط تھی۔ ان کے درمیان ضرورت سے بڑھ کر محبت کا مضبوط رشتہ تھا۔ اس طویل عرصے میں ان کے درمیان مشابہت تک پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں کے نقوش ملتے جلتے تو پہلے ہی تھے۔ ہم آہنگی انہیں مشابہت سے قریب تر لے گئی تھی لیکن جسمانی فرق نمایاں تھا۔ شاہ زیب طویل القامت تھا اور اس کی کمر اب تک سیدھی تھی جبکہ گٹھیا کے درد نے تمکنت کو وہیل چیئر پر پہنچا دیا تھا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کبھی وہ دراز قد تھی۔

اس تفاوت کے باوجود شاہ زیب کی وفا اور محبت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ وکیل تھا۔ بیس سال تک وہ کونسلر منتخب ہوتا رہا تھا لیکن مشیر بننے کے مواقع اس نے ہر بار ٹھکرا دیے تھے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ ایسا تمکنت کی وجہ سے ہوا۔ تمکنت کی معذوری اس کی راہ کی رکاوٹ بن گئی تھی۔

تمکنت نے دیواری گھڑی کو دیکھا اور پرتشویش لہجے میں بولی۔ ''یہ لوگ لیٹ نہیں ہو گئے؟''

''پریشان مت ہو۔'' شاہ زیب نے اسے دلاسا دیا۔ ''سفینہ بہت اچھی ڈرائیور ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ بس میں......''

وہ نامکمل جملہ بھی شاہ زیب کی سمجھ میں آ گیا۔ 21 سال کی عمر میں سفینہ پہلی بار ان سے ملی تھی۔ ان دنوں وہ قانون کی تعلیم شروع کر رہی تھی اور انہوں نے گورنس کی ضرورت کے لیے جو اشتہار دیا تھا' وہ اس کے جواب میں آئی تھی۔ پہلے ہی لمحے سے انہوں نے اسے بیٹی سمجھا تھا۔ یہ تیرہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سے اب تک شاہ زیب نے ہی سفینہ کا کیریئر بنانے میں اس کی معاونت کی تھی۔ یہاں تک کہ اب اسی کی وجہ سے سفینہ کا نام جج شپ کے امیدواروں میں شامل تھا۔

دس منٹ بعد سفینہ اپنی بیٹی کے ساتھ آ گئی۔ طوبیٰ کا اندازہ درست تھا۔ اس کے لیے ایک کتاب اور کمپیوٹر گیمز کی ایک ڈسک کا تحفہ تیار تھا۔ کھانے کے بعد وہ لائبریری میں چلی گئی۔ بڑوں میں بیٹھنے سے بہتر یہ تھا کہ وہ اپنی کتاب پڑھ لے۔

اس کے جانے کے بعد تمکنت نے سفینہ سے پوچھا ''طوبیٰ کے چہرے پر کوئی داغ تو نہیں رہے گا نا؟''

''میں نے یہی بات ڈاکٹر سلمان سے پوچھی تھی۔ وہ برا مان گئے' جیسے میرا یہ خدشہ ان کے فن کی توہین ہو۔'' سفینہ نے جواب دیا۔ وہ اب بھی اس جانی پہچانی عورت کے بارے میں سوچ رہی تھی' جسے اس نے ڈاکٹر کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس نے شاہ زیب اور تمکنت کو اس بارے میں بتایا ''لیکن نرس نے جو اس کا نام بتایا' وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ پتا ہے' مجھے اب بھی لگتا ہے کہ میں اس سے مل چکی ہوں اور مجھے اس سے خوف بھی آیا۔ ہے نا عجیب بات؟''

''وہ دیکھنے میں کیسی تھی؟''

''بہت ہی حسین...... ہیجان انگیز۔ کیا پتا' وقاص کی کوئی پرانی دوست ہو۔'' سفینہ نے کہا ''لیکن جب تک مجھے صحیح طور پر یاد نہیں آتا' اس کی خلش ستاتی رہے گی۔''

☆☆☆

بابرا ذیشان نے اس کے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا تھا ''ڈاکٹر آپ نے میری زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔''

ڈاکٹر سلمان جانتا تھا کہ یہ بات لفظ بہ لفظ درست ہے۔ بابرا سرجری سے پہلے بدشکل عورت تھی۔ اس نے اسے حسن عطا کیا تھا۔ حسن بھی ایسا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔ وہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتی تھی۔ ذہین وہ بے حد تھی لیکن کوئی اسے پوچھتا نہیں تھا۔ اب وہ ذہانت اور بے مثال حسن کا شاندار امتزاج تھی۔ اب لوگ اس پر پروانہ وار گرتے تھے۔

ڈاکٹر سلمان نے ساڑھے چھ بجے آخری مریض کو دیکھا پھر وہ گھر کی طرف چل دیا۔ وہ تنہا آدمی تھا۔ اس کے لگے بندھے معمولات تھے۔ گھر جا کر وہ کافی

بناتا۔ کافی پیتے ہوئے وہ خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتا پھر سوچتا کہ کھانا کہاں کھائے۔ کھانا وہ زیادہ تر باہر ہی کھاتا تھا۔

اس روز وہ بہت مضطرب اور بے سکون تھا۔ تمام عورتوں میں ایک بابرا تھی' جس کی نازنین سے مشابہت مکمل کہی جا سکتی تھی۔ بابرا کو دیکھ کر وہ بے قرار ہو جاتا اور اس نے بابرا کو نرس صالحہ سے کہتے سنا تھا کہ آج وہ مون لائٹ میں ڈنر کرے گی۔

ڈاکٹر کو اس روز کافی میں بھی لطف نہیں آیا۔ اس کی بے آرامی بھی اپنی جگہ رہی۔ کچھ دیر وہ ہچکچاتا رہا مگر بالاخر وہ گھر سے نکل آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ وہ مون لائٹ جائے گا۔ کسی ایسی میز پر بیٹھ کر کھانا کھائے گا' جہاں سے اسے بابرا کی دید میسر آتی رہے گی۔ قسمت نے ساتھ دیا تو بابرا کو پتا بھی نہیں چلے گا اور اگر اس نے دیکھ بھی لیا تو کوئی بات نہیں۔ اس کے پاس یہ سوچنے کا تو کوئی جواز نہیں کہ وہ اس کا تعاقب کر رہا ہے!

☆☆☆

سفینہ' شاہ زیب کے گھر سے واپس آئی تو کام میں مصروف ہوگئی۔ طوبیٰ گھر پہنچتے ہی سوگئی۔

سفینہ کو اگلے روز قتل کے مقدمے میں ملزم پر جرح کرنی تھی۔ ملزم بلاشبہ بہت اچھا اداکار تھا۔ گواہوں کے کٹہرے میں اس کی پرفارمنس شاندار تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کا سپروائزر ہمیشہ اس کی توہین کرتا رہتا تھا۔ مسلسل توہین نے بالاخر اسے توڑ ڈالا اور اس نے جنون کی کیفیت میں اسے قتل کر دیا۔ اس کا وکیل بھی اس قتل کو اضطراری فعل ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سفینہ کو یہ پہلو اجاگر کرنا تھا کہ قتل سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے اور توہین کرنے والے سپروائزر نے درحقیقت اپنی رپورٹ میں ملزم کی ترقی کی سفارش کی تھی۔

رات کا ایک بج گیا لیکن وہ مطمئن ہو کر اٹھی۔ اس نے تمام اہم نکات ترتیب دے کر لکھ لیے تھے۔ خواب گاہ میں پہنچ کر اس نے طوبیٰ کو دیکھا' جو پرسکون نیند سو رہی تھی۔ وہ خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ تھکن اتنی تھی کہ نیند فوراً آ جانی

چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نجانے کیوں وہ بے چین تھی۔

بالاخر وہ سو گئی لیکن پانچ بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ چھ بجے تک وہ سونے جاگنے کی درمیانی کیفیت میں رہی۔ اسی دوران میں اس نے وہ خواب دیکھا۔ وہ کسی ڈاکٹر کے مطب میں ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ سامنے فرش پر ایک عورت پڑی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں خالی پن کا تاثر لیے ایک طرف جمی ہوئی تھیں۔ گہرے سیاہ رنگ کے بالوں کے درمیان اس کا خوب صورت چہرہ اور زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا پھر اچانک اس کی نظر عورت کے گلے پر پڑی۔ اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی کا پھندا پڑا تھا۔

پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ عورت اٹھی' اس نے پھندا نکالا اور استقبالیہ کلرک کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے وقت لے رہی تھی!

☆☆☆

شام کو وقاص مرزا کو خیال آیا کہ فون کر کے طوبیٰ کا حال چال پوچھے۔ آج وہ ڈاکٹر کے ہاں گئی ہوگی لیکن وہ اس ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ اس کا سسر ریحان جعفری ایڈووکیٹ' جس کے ساتھ وہ وکالت کرتا تھا' اس کے گھر آ گیا تھا۔ وہ اپنے اہم ترین موکل امتیاز حیدر کے ٹیکس چوری کیس کے بارے میں حکمت عملی طے کرنا چاہتا تھا۔ ان کا موکل امتیاز حیدر ایک بدنام آدمی اور ایک متنازعہ شخصیت تھا۔

امتیاز حیدر کا کاروبار کئی سمتوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کا سیاسی اثر و رسوخ بھی بہت زیادہ تھا۔ وہ نہ صرف فلاحی اور رفاہی انجمنوں کو دل کھول کر چندے دیتا بلکہ وہ اہم سیاسی جماعتوں کو بھی خاموشی سے نوازتا رہتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مجرموں کے بڑے گروہوں کے ساتھ بھی ملوث ہے اور ان کی پشت پناہی کرتا ہے۔ برسوں سے قانون نافذ کرنے والے ادارے اسے گھیرنے کے چکر میں تھے لیکن اب تک انہیں کوئی اہم کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

ریحان اور وقاص برسوں سے امتیاز کے وکیل تھے۔ اس سے تعلق ان کے لیے بے حد منفعت بخش تھا۔ اب تک وہ کامیاب بھی تھے کیونکہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کوئی ایسا ثبوت حاصل نہیں کر سکے تھے' جس کے زور پر وہ امتیاز پر

مضبوطی کے ساتھ ہاتھ ڈالتے۔

''لیکن اس بار معاملہ کچھ سنگین ہے۔'' ریحان اپنے داماد سے کہہ رہا تھا ''اور سنگین صرف حیدر ہی کے لیے نہیں' ہمارے لیے بھی ہے۔''

وقاص کو ریحان کی لافرم سے منسلک ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں اس نے دیکھا کہ فرم صرف اور صرف امتیاز حیدر کی وجہ سے قائم ہے بلکہ وہ اسے امتیاز کا کوئی ذیلی کاروباری ادارہ معلوم ہوتی تھی۔ اب صورتحال یہ تھی کہ امتیاز پر جرم ثابت ہو جاتا تو ان کی لافرم خود بخود ختم ہو جاتی۔

''میں فواد کی طرف سے فکرمند ہوں۔'' وقاص نے اپنے سسر سے کہا۔ فواد اصغر امتیاز کا چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔ موجودہ کیس میں وہ بھی معاون ملزم کی حیثیت سے ملوث تھا۔ اس پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ وعدہ معاف گواہ بن جائے۔ اس کے صلے میں اس کی اپنی جان بچ سکتی تھی۔

ریحان جعفری نے اثبات میں سر ہلایا ''میں تم سے متفق ہوں۔''

''اور اس کی ایک سے زیادہ وجوہ ہیں۔'' وقاص نے کہا ''میں نے آپ کو اپنی گاڑی کے حادثے کے بارے میں بتایا تھا نا۔ طوبیٰ کا علاج جو ڈاکٹر کر رہا ہے' میں نے آپ کو اس کا نام نہیں بتایا۔ اس کا نام ڈاکٹر سلمان احسن ہے۔''

ریحان جعفری سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''یہ وہی تو نہیں' جس کی......''

''یہ وہی ہے۔'' وقاص نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''اور آپ میری پہلی بیوی کو جانتے ہیں۔ وہ اسسٹنٹ پروسیکیوٹر ہے۔'' اسے یہ تعلق ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

''خدا کی پناہ۔ یہ تو دھماکا خیز صورتحال ہے۔'' ریحان جعفری نے بے حد پریشان ہو کر کہا۔

☆☆☆

پروسیکیوٹر کا آفس کورٹ ہاؤس کی دوسری منزل پر تھا۔ وہاں پروسیکیوٹر اظہر عباس کے علاوہ 135 اسسٹنٹ پروسیکیوٹر' 70 تفتیش کار اور 25 سیکرٹری کام کرتے تھے۔ کام کا بوجھ زیادہ ہونے کے باوجود وہاں کا ماحول بہت خوشگوار اور

دوستانہ تھا۔ سفینہ وہاں بہت خوش تھی۔

مختلف لافرمز سفینہ کو جاب کی پیشکش کرتی رہتی تھیں لیکن بہت اچھی آمدنی کی ترغیب کے باوجود اس نے کبھی کسی پیشکش کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا اور اب تو وہ آزادانہ طور پر وکیل استغاثہ کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ اس حیثیت میں اس کی اپنی ایک ساکھ بن گئی تھی۔ ایک ذہین' انصاف پسند اور باضمیر وکیل کی حیثیت میں اس کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔

ابھی حال ہی میں دو جج ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کی جگہ پر کرنے کے لیے جو نام آگے بڑھائے گئے تھے' ان میں شاہ زیب کی مہربانی سے سفینہ کا نام بھی تھا۔ سفینہ نے اس بات کی کبھی خود کو بھی خبر نہیں ہونے دی کہ وہ اس پوسٹ کی کتنی شدت سے خواہاں ہے۔ بے شک' لافرمز بہت پیسہ دے سکتی ہیں' بے شمار سہولتوں کی آفر کرتی ہیں لیکن ایک جج کا باعزت رتبہ ہماری ساری دنیا کی دولت سے بڑا ہوتا ہے۔

سفینہ اس وقت اپنے دفتر میں تھی۔ وہ اپنی میز پر رکھے فائلوں کے انبار کو گھور رہی تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک فائل اٹھا لی۔ اس وقت سب سے زیادہ اہم وہ کیس تھا' جس کی سماعت ابھی ایک گھنٹے بعد شروع ہونے والی تھی۔

مقتول سپروائزر نے اپنے پیچھے دو بیٹے چھوڑے تھے' جن کی عمریں بارہ اور دس سال تھیں۔ اس کی بیوی کا پانچ سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ یعنی دونوں بچوں کا اب کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو طوبیٰ کا کیا ہوگا' سفینہ نے سوچا۔ وہ اپنے باپ کے پاس بھی نہیں جا سکتی۔ وہاں کون اسے قبول کرے گا۔ اس کے سامنے اس کی اپنی زندگی کی تصویر تھی۔ امی نے جب دوسری شادی کی تو وہ کتنے دن ان کے ساتھ رہ سکی۔ اسے اپنے باپ کا نعم البدل نہ مل سکا۔ بلکہ اس سے ماں بھی چھن گئی۔ یہی ہوتا ہے۔ بس اللہ مجھے زندگی دے۔ طوبیٰ کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہو۔

اس نے سر جھکا اور فائل کھول لی۔

نو بج کر دس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف پروسیکیوٹر اظہر عباس تھا

"سفینہ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کورٹ جانا ہے۔ جاتے ہوئے مجھ سے مل لینا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے جناب۔"

کورٹ جاتے ہوئے وہ اظہر کے کمرے میں چلی گئی۔ اظہر بہت اچھے لباس میں تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ پرانا میئر تین میعادیں پوری کرنے والا تھا اور اب میئر کا الیکشن نہیں لڑ سکتا تھا۔ اس کی نظر انتخاب اظہر عباس پر پڑی تھی۔ اظہر نے ریٹائرمنٹ کی درخواست بھی دے دی تھی تاکہ پہلے کونسلر اور پھر میئر کا الیکشن لڑ سکے۔ اخبارات کی رائے تھی کہ میئر عوام میں اتنا مقبول ہے کہ وہ جس کی حمایت کرے گا' وہ ہی نیا میئر منتخب ہوگا اور سفینہ جانتی تھی کہ میئر اور شاہ زیب اکبر کا انتخاب اظہر عباس ہے۔

اظہر کی قانون پر گہری نظر تھی۔ سفینہ اس کی اس خوبی کو سراہتی تھی۔ اسے اس سے یہ شکایت تھی کہ اس کے کسی اسسٹنٹ سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو وہ اسے معاف نہیں کرتا بلکہ ذاتی طور پر اس سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس کی اولین وفاداری اپنی ذات اور اپنے مفادات کے لیے تھی۔

"آؤ سفینہ۔" اظہر نے کہا "اور سناؤ۔ طوبیٰ کا کیا حال ہے؟"

سفینہ نے اسے ڈاکٹر کے وزٹ کے بارے میں بتایا۔

"ایکسیڈنٹ کے وقت بچی باپ کے ساتھ تھی نا؟" اظہر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وقاص ڈرائیو کر رہا تھا۔"

"ویسے میرے خیال میں تمہارے سابقہ شوہر کی قسمت اب اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس بار وہ امتیاز کو بچا سکے گا۔ میں نے سنا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس بار وہ اسے رگڑ دیں گے۔ میں اسے معاشرے کا ناسور سمجھتا ہوں۔" اظہر نے کہا۔ "ارے ہاں...... آج تمہیں ملزم پر جرح کرنی ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"میں تمہیں جانتا ہوں اس لیے اس بے چارے سے ہمدردی کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ گڈ لک سفینہ۔"

☆☆☆

پیر۔ 23 اکتوبر!

مقدمہ نمٹ چکا تھا۔ سفینہ کامیاب ہوئی تھی۔ اس نے ملزم کو مجرم ثابت کر دیا تھا۔ مجرم کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔ اب کم از کم مقتول کے بچوں کو یہ دکھ کبھی نہیں ستائے گا کہ ان کے باپ کا قاتل سڑکوں پر آزاد گھوم رہا ہے۔

اب اس وقت سفینہ پھر ڈاکٹر سلمان کے ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا بریف کیس کھول کر اخبار نکالا اور پڑھنے لگی۔ یہ طوبیٰ کا دوسرا چیک اپ تھا اور روٹین کا معاملہ تھا اس لیے وہ بے فکر تھی۔ دوسرے وہ امتیاز حیدر کیس کے بارے میں پڑھنے کے لیے بھی بے چین ہو رہی تھی۔

اظہر عباس کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ مقدمہ ملزم کے خلاف جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس مقدمے سے پہلے اس کے خلاف رشوت دینے' ناجائز کاروبار اور بلیک منی کو وائٹ کرنے کے الزامات موثر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے واپس لیے جا چکے تھے۔ لیکن اس بار پروسیکیوٹر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے پاس ایک ناقابل شکست کیس ہے۔

ازدواجی زندگی کے دوران میں وقاص نے ایک بار سفینہ کو امتیاز سے ملوایا تھا۔ اب وہ اخبار میں اس کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ تصویر میں وہ وقاص کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ بیش قیمت سوٹ کو ہٹا دیا جائے تو یہ شخص ایک بدمعاش ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس مجرم کو سہارا دے رہا تھا۔

اس نے رپورٹ پڑھی اور اخبار کو دوبارہ بریف کیس میں رکھ لیا۔ اسے وہ وقت اب بھی یاد تھا' جب طوبیٰ کی پیدائش کے بعد وقاص نے اسے بتایا تھا کہ اس نے ریحان جعفری کا اشتراک قبول کر لیا ہے۔ وہ یہ سن کر ششدر رہ گئی تھی "تم جس لا فرم کی بات کر رہے ہو' اس کے موکلوں کا ایک پاؤں ہمیشہ جیل کے اندر رہتا ہے۔" اس نے احتجاج کیا تھا "اور وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کا دوسرا پاؤں بھی جیل میں ہی ہو۔"

"لیکن وہ کمپنی کو خطیر رقمیں ادا کرتے ہیں۔" وقاص نے جواب دیا تھا

"سفینہ! تم بے شک پروسیکیوٹر کے آفس میں سڑتی رہو۔ میں زندگی میں کچھ بننا چاہتا ہوں۔"

اور ایک سال بعد وقاص نے اعلان کیا کہ وہ ریحان جعفری کی بیٹی شگفتہ کا شوہر بننا چاہتا ہے۔"

اس تلخ یاد نے سفینہ کو سر جھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ حال میں واپس آئی تو ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔

دروازہ کھلا تو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اندر سے نکلنے والی عورت کے سیاہ بال اس کے چاند سے روشن چہرے کو بدلیوں کی طرح گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ وہی خوبصورت بھرے بھرے ہونٹ، وہی بڑی بڑی روشن آنکھیں اور وہی محراب دار بھویں لیکن یہ وہ عورت نہیں تھی، جسے اس نے پچھلی بار دیکھا تھا مگر چہرہ وہی تھا۔ تو کیا وہ آپس میں بہنیں ہیں؟ اگر وہ ڈاکٹر کی مریضائیں ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ڈاکٹر نے انہیں ایک جیسا چہرہ دیا ہو۔ وہ سوچتی رہی کہ اس کے چہرے کو دیکھ کر اسے کوئی یاد آتے آتے رہ جاتا ہے۔ کیوں؟ اور وہ ڈراؤنا خواب؟

"مس انصار۔"

اس نے چونک کر دیکھا۔ نرس اسے ڈاکٹر کے کمرے میں جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ نرس کے ساتھ کمرے میں جاتے ہوئے اس نے پوچھا "یہ عورت جو ابھی نکلی ہے، اس کا کیا نام ہے؟"

یاسمین قزلباش۔" نرس صالحہ نے جواب دیا۔

کمرے میں طوبیٰ، ڈاکٹر سلمان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ اپنی گود میں رکھے تھے اور وہ تنی بیٹھی تھی۔ سفینہ کو دیکھ کر وہ پرسکون نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر نے سفینہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں طوبیٰ کو بتا رہا تھا کہ عورتیں مجھ سے جس حسن کی طلب کرتی ہوئی آتی ہیں، اس سے اسے قدرت نے خوب نوازا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "تو اسے اس حسن کی حفاظت بھی کرنی چاہیے۔ اس نے بتایا ہے کہ حادثے کے وقت یہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ تھی۔ میں آپ سے اصرار کر رہا ہوں کہ آپ اپنی بیٹی سے بے پروائی نہ

کریں۔ اس کی خوبصورتی بے مثال ہے۔ آپ کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔"

☆☆☆

طوبیٰ کی ضد پر سفینہ اسے کھانا کھلانے کے لیے کیفے درخشاں لے گئی۔ "مجھے یہاں کے جھینگے بہت پسند ہیں۔" طوبیٰ نے کہا۔ ذرا دیر کے بعد اس نے افسردہ لہجے میں کہا "ڈیڈی ایک بار مجھے یہاں لائے تھے۔"

تو طوبیٰ نے اس لیے اس ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا ہے، سفینہ نے دل میں سوچا اور حادثے کے بعد وقاص نے اتنے دن میں صرف ایک بار فون کیا ہے اور وہ بھی اس وقت جب طوبیٰ سکول گئی ہوئی تھی اور وہ دفتر۔ فون سے منسلک ریکارڈنگ مشین پر اس کا پیغام ملا تھا اور اس میں بھی جوابی فون کی فرمائش تھی۔

ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو طوبیٰ نے کہا "ممی میں ڈاکٹر سلمان کے پاس نہیں جاؤں گی۔ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔"

سفینہ کا دل ڈوبنے لگا۔ یہی بات تو وہ خود بھی سوچ رہی تھی۔ اب اس نے سوچا کہ کسی اور ڈاکٹر کو بھی دکھا لیا جائے تاکہ طوبیٰ کے چہرے پر کوئی نشان نہ رہے مگر اس نے بچی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر اپنے کام کا ماہر ہے۔ اس کی شخصیت پر نہ جاؤ۔"

اس نے طوبیٰ کو مسکرا کر دیکھا "اور اب اس نے تمہیں ایک ماہ بعد بلایا ہے۔ اس کے بعد ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اب اس میں ڈاکٹر کا کیا قصور کہ اللہ نے اسے بے کشش بنایا ہے۔"

"کشش کو چھوڑیں۔" طوبیٰ نے ہنس کر کہا "وہ بہت ڈراؤنے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو ڈر لگتا ہے۔"

کھانے کے دوران میں وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ طوبیٰ کو فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا۔ وہ سکول میں اس کا بنیادی کورس بھی رہی تھی۔ آج کل اسے موسم خزاں کی فوٹوگرافی کا کام دیا گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق بتاتی رہی پھر اچانک اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ "کیا بات ہے طوبیٰ؟" سفینہ نے پوچھا۔

"ڈیڈی.....اوہ، انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

"سنو طوبیٰ' انہیں اپنے پاس آنے دو۔" سفینہ نے کہا اور پلٹ کر دیکھا۔
وقاص اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ امتیاز حیدر بھی تھا۔

ہمیشہ کی طرح وقاص اس وقت بھی بہت شاندار لگ رہا تھا۔ عدالت میں تھکا دینے والا دن بھی اس کی تازگی اور شادابی میں کوئی فرق نہیں ڈال سکا تھا۔ اس کا لباس بھی بے شکن تھا۔

وقاص آیا تو طوبیٰ اس سے لپٹ گئی "سوری ڈیڈی' میں نے آپ کی کال مس کر دی۔"

سفینہ کو بچی پر ترس آنے لگا پھر اسے احساس ہوا کہ امتیاز حیدر اسے بغور دیکھ رہا ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی مسز وقاص۔" امتیاز نے کہا۔

"یہ نام میں برسوں پہلے ترک کر چکی ہوں۔ اب آپ مجھے مس انصار کہہ سکتے ہیں۔" سفینہ نے خشک لہجے میں کہا' ویسے آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔ حسین عورتوں کو میں کبھی نہیں بھولتا۔"

سفینہ نے کچھ نہیں کہا' بس منہ پھیر لیا۔ اس لمحے وقاص نے طوبیٰ کو اپنے سے علیحدہ کیا "اس نے سفینہ سے پوچھا۔

"ہمیشہ کی طرح بالکل ٹھیک۔ ہاں...... اب ہم نکل ہی رہے تھے۔"

☆☆☆

اپنی میز پر بیٹھنے کے بعد امتیاز حیدر نے وقاص سے کہا۔ "تمہاری سابقہ بیوی تمہیں ناپسند کرتی ہے۔"

وقاص نے بے پراوئی سے کندھے جھٹک دیے۔ "وہ بہت سنجیدہ طبع ہے۔ ہر بات کو سیریس لیتی ہے۔ کاش وہ بھی شادی کر لیتی۔"

"یہ تمہاری بچی کے چہرے کو کیا ہوا؟"

"میں نے ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتایا تھا نا۔"

"کسی اچھے پلاسٹک سرجن کو دکھایا بھی ہے یا نہیں۔"

"ہاں' دکھایا ہے۔ کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔" وقاص نے گفتگو کا

رخ بدلنا چاہا۔

"کس ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟"

وقاص دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ نہ سفینہ اور طوبیٰ سے یہاں ملاقات ہوتی' نہ امتیاز ڈاکٹر کے پیچھے پڑتا۔ اب تو بتانا لازمی تھا "ڈاکٹر سلمان احسن" اس نے کہا۔

"ڈاکٹر سلمان؟ مذاق کر رہے ہو؟"

"کاش ایسا ہی ہوتا......"

"خیر......سنا ہے' وہ ریٹائر ہونے والا ہے۔ ان کی صحت کے مسائل سنگین ہو گئے ہیں۔"

وقاص نے چونک کر اسے دیکھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

امتیاز نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا "میں کبھی اس سے بے خبر نہیں رہتا۔ وجہ تم جانتے ہی ہو۔"

☆☆☆

اس رات اس نے دوسری بار خواب دیکھا۔ وہ ڈاکٹر کے آفس میں ہے۔ ایک عورت فرش پر پڑی ہے۔ اس کے گلے میں بٹی ہوئی رسی کا پھندا ہے۔ اس کا منہ کھلا ہے اور زبان کی نوک باہر نکلی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ عورت کے خوبصورت چہرے کے گرد سیاہ بالوں کا گھیرا ہے۔

خواب میں سفینہ نے چیخنے کی کوشش کی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ اگلے ہی لمحے طوبیٰ اسے جھنجوڑ رہی تھی۔ "ممی...... ممی' کیا ہوا؟ اٹھیے نا۔"

سفینہ نے آنکھیں کھول دیں "او شکریہ بیٹی۔ میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔"

طوبیٰ پھر سو گئی۔ سفینہ جاگتی اور سوچتی رہی۔ وہ خواب یاد کر رہی تھی۔ اس بار اس نے عورت کے جسم پر گلاب کے پھول بکھرے دیکھے تھے۔ اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اوہ...... یہ بات ہے۔ وہ عورتیں' جنہیں اس نے ڈاکٹر کے مطب میں دیکھا تھا۔ اس نے پہچان لیا تھا کہ وہ کس سے مشابہ ہیں۔

نازنین مختار! جانم مرڈر کیس والی نازنین مختار' جسے گیارہ برس پہلے اس کے شوہر مختار عظیم نے قتل کیا تھا۔ اس قتل کو اخباروں نے بڑی شہرت دی تھی۔ محبت' بے وفائی اور ہوس کا پس منظر رکھنے والا وہ قتل' جس میں قاتل نے حسین مقتولہ کے جسم پر گلاب بکھیر دیے تھے۔

جس روز انہوں نے پروسیکیوٹر آفس جوائن کیا تھا' اس روز عدالت نے نازنین کے شوہر کو سزا سنائی تھی۔ اخبارات نازنین کی تصاویر سے بھرے ہوئے تھے مگر اہم بات یہ نہیں' کچھ اور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر سلمان نے دو عورتوں کے چہرے نازنین جیسے کیوں بنا دیے۔ دو چہرے...... آخر کیوں؟

☆☆☆

ڈاکٹر سلمان کو یہ خیال ستاتا رہتا تھا کہ اس نے یاسمین قزلباش کو وہی چہرہ دے کر غلطی کی ہے۔ وہ عورت نہ خوش ادا ہے نہ خوش اطوار اور اس کمی کی تلافی وہ حسن بھی نہیں کر سکتا' جو اس نے سرجری کے ذریعے اسے دیا تھا۔ اس عورت کی تو آواز اور لہجہ بھی اس نئی صورت سے میچ نہیں کرتا۔

یہ بات مجھے پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے تھی۔ اس نے سوچا مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ پہلے ہی سمجھتا تھا لیکن اس معاملے میں اسے خود پر اختیار نہیں تھا۔ یاسمین کے جسم کی بناوٹ ایسی تھی کہ اس روپ کے لیے بے حد مناسب تھی اور یہ تبدیلی اس کے ہاتھوں عمل میں آئے گی' یہ خیال اس کے لیے بے حد خوش کن تھا۔ پچھلے تجربے نے اسے جو روحانی خوشی' لذت اور ہیجان دیا تھا' وہ اسے یاد تھا۔ اسی لیے وہ اس تجربے کو دہرانے کے لیے بے چین تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ جب یہ آپریشن اس کے بس کے نہیں رہیں گے' تب وہ کیا کرے گا۔ وہ وقت تو بہت تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کا رعشہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے میں کوئی اتنے نازک آپریشن کیسے کر سکتا ہے۔

اس نے لائٹ آن کی۔ اس کے بیڈ کے سامنے دیوار پر آویزاں فریم شدہ تصویر بھی جیسے روشن ہو گئی۔ ہر روز سونے سے پہلے وہ اس تصویر کو ضرور دیکھتا تھا۔ وہ کتنی خوبصورت تھی لیکن اب چشمے کے بغیر وہ اسے دیکھتا تو وہ ٹوٹی پھوٹی نظر

آتی...... ویسی جیسا اس نے اسے موت کے بعد دیکھا تھا۔

''نازو......'' وہ بڑبڑایا لیکن پھر دکھ بھری یادوں نے اس کے دماغ کو بھر دیا۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ وہ اس کی موت کے بعد کی دید کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ موت نے اس سے اس کا حسن چھین لیا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں بجھ گئی تھیں۔ دہشت سے پھیلی ہوئی وہ آنکھیں بہت ڈراؤنی لگ رہی تھیں اور اس کی زبان بھی تو باہر نکلی ہوئی تھی۔

یہ سب کچھ یاد کرنے کے بعد وہ سو نہیں سکا۔ نیند کیسے آ سکتی تھی!

☆☆☆

منگل 24 اکتوبر!

منگل کی صبح آفس پہنچتے ہی سفینہ نے اپنے محسن' اپنے مربی شاہ زیب اکبر کو فون کیا۔ ہمیشہ کی طرح شاہ زیب کی آواز سن کر اسے سکون کا احساس ہوا۔ اس نے بلا تمہید اپنی بات شروع کر دی۔ ''کل میں طوبیٰ کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر سلمان کے پاس لے گئی تھی۔ سب ٹھیک ہے لیکن میں خراشوں کے بارے میں کسی اور سرجن سے بھی رائے لینا چاہتی ہوں۔ آپ کسی اچھے پلاسٹک سرجن کو جانتے ہیں؟''

''نہیں لیکن یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے میں معلوم کر کے بتا دوں گا مگر بات کیا ہے؟ تم مطمئن نہیں ہو؟''

''اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ ملاقات پر بتاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں شام تک تمہیں فون کر کے بتا دوں گا۔''

''شکریہ انکل۔''

''یو آر ویل کم یور آنر۔''

''انکل پلیز' ابھی یہ نہیں۔ میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔''

جواب میں شاہ زیب نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر فون رکھ دیا۔

اس کے بعد اس نے یونس نصیر کو فون کیا۔ یونس اس آفس کے بہترین تفتیش کاروں میں سے تھا۔ سفینہ نے اسے لنچ پر مدعو کیا۔ ''خیریت تو ہے۔'' یونس نے پوچھا۔

''ہاں - کچھ بات کرنی ہے۔ تمہیں دس گیارہ سال پہلے کا جانم مرڈر کیس یاد ہے؟''

''یاد ہے۔ وہ بڑا کیس تھا۔ ہمارے چیف نے اسی میں نام کمایا تھا۔'' یونس نے کہا۔

سفینہ کو معلوم تھا کہ یونس' اظہر عباس کو ناپسند کرتا ہے۔ '' کچھ ایسی بات ہوئی ہے کہ مجھے اس کیس کے بارے میں تجسس پیدا ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا '' مجھے اس کیس کا مکمل ریکارڈ درکار ہے۔''

''تمہیں میں انکار نہیں کرسکتا خاتون لیکن یہ تو پرانا کیس ہے اور نمٹ بھی چکا ہے۔''

''وجہ میں بعد میں بتاؤں گی۔''

سفینہ نے کیفے ٹیریا سے سینڈوچ منگوا لیے۔ ڈیڑھ بجے یونس آیا تو اس کے پاس ایک بہت بڑا اور پھولا ہوا لفافہ تھا ''یہ لو...... حسب فرمائش۔'' اس نے لفافہ سفینہ کے سامنے ڈال دیا۔

یونس بظاہر موٹا اور بے ضرر لگتا تھا لیکن سفینہ اس کی مستعدی سے خوب واقف تھی۔ اس نے کئی اہم کیسوں میں یونس کے ساتھ کام کیا تھا '' شکریہ یونس'' اس نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں اور میں لنچ بھی نہیں کروں گا پھر کبھی سہی۔''

سفینہ کا ارادہ تھا کہ لفافہ گھر لے جائے گی اور رات کو سکون سے پڑھے گی لیکن اس سے صبر نہیں ہوا۔ سب سے اوپر ایک اخباری تراشہ تھا' جس کے مطابق مختار عظیم نے دوبارہ مقدمہ چلانے کے سلسلے میں پانچویں بار اپیل کی تھی' جسے سپریم کورٹ نے مسترد کر دیا تھا۔ اس کے وکیل جعفر سعید نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ اگلی اپیل کے لیے جواز ڈھونڈ کر رہے گا '' میں کوشش کرتا رہوں گا' کیے جاؤں گا۔ جب تک مختار عظیم کو باعزت بری نہیں کیا جاتا۔ وہ بے قصور ہے'' یہ اس کے الفاظ تھے۔

سفینہ نے سوچا' ہر وکیل یہی کہتا ہے۔

☆☆☆

وہ تسلسل کے ساتھ دوسری رات تھی کہ وقاص' امتیاز کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ دونوں بہت چپ چپ تھے۔ یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ امتیاز کا دست راست اور راز دار فواد اصغر پولیس کے رابطے میں ہے اور اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''وہ وعدہ معاف گواہ بن گیا تو بھی گواہوں کے کٹہرے میں' میں اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔'' وقاص نے امتیاز کو یقین دلایا۔

''یہ تمہارا خیال ہے۔ ایسا ہو جائے تو بھی ناکافی ہے۔ مجھے تو تمہاری فکر ہے۔ میرا خیال ہے' تمہیں اپنے بچاؤ کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔'' امتیاز نے کہا۔

وقاص نے اس تبصرے کو نظر انداز کیا اور مینیو کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا '' میں اور شگفتہ آج رات ارشد کی ہاں جا رہے ہیں۔ تمہارا پروگرام ہے؟''

''نہیں بھئی۔ مجھے اب اس کے حوالوں کی ضرورت نہیں۔ تم جانتے ہو' ان سے مجھے کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔''

☆☆☆

وہ ایک سرد شام تھی۔ سفینہ نے آتش دان روشن کر دیا تھا۔ وہ اور طوبیٰ محبت بھری خاموشی میں لپٹی بیٹھی تھیں پھر طوبیٰ ماں کو اپنی فوٹو گرافی کے بارے میں بتانے لگی۔ پھر اس نے پوچھا ''یہ آپ کیا پڑھ رہی ہیں ممی۔''

''تم یہاں آؤ ذرا۔'' سفینہ نے اخبار کا وہ تراشہ لہراتے ہوئے کہا جس میں مقتولہ نازنین کی تصویر چھپی تھی ''یہ دیکھو..... اس عورت کو پہچانتی ہو؟''

طوبیٰ نے تصویر دیکھتے ہی کہا ''نہیں تو کل میں نے ڈاکٹر کے کمرے میں دیکھا تھا۔''

''شاباش۔ بڑی اچھی نگاہ ہے تمہاری لیکن یہ وہ عورت نہیں ہے۔''

سفینہ اب قتل کی واردات کی تفصیل پڑھ رہی تھی۔ نازنین کے لکھ پتی شوہر کا کہنا تھا کہ وہ آدھی رات کو گھر واپس آیا تو اسے نازنین کی لاش نظر آئی۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا اور اس کے جسم پر گلاب کے بے شمار پھول بکھیر دیئے گئے تھے۔

بیس منٹ بعد سفینہ نے وہ تراشہ دیکھا' جسے پڑھ کر اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ مقتولہ کے باپ ڈاکٹر سلمان احسن کا بیان سننے کے بعد پولیس نے مختار عظیم پر فرد جرم عائد کر دی تھی۔ ڈاکٹر سلمان نے پولیس کو بتایا تھا کہ مختار دیوانگی کی حد تک شکی مزاج تھا اور اس کی بیٹی اس سے خوف زدہ رہتی تھی۔

تو ڈاکٹر سلمان نازنین کا باپ تھا! ناقابل یقین۔ تو کیا اسی لیے وہ دوسری عورتوں کو نازنین کا چہرہ دے رہا ہے۔ کیسی عجیب اور خوفناک بات ہے۔

''کیا بات ہے ممی؟ یہ آپ کا چہرہ کیسا ہو رہا ہے؟'' طوبیٰ نے اسے ٹوکا۔

''کچھ نہیں بیٹی۔ ایک کیس کے متعلق پڑھ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر سفینہ نے

دیواری گھڑی کو دیکھا ''نو بج گئے بیٹا۔ بس اب تم سو جاؤ۔''

طوبیٰ اپنی تصویریں سمیٹنے لگی۔ سفینہ اپنی گود میں تراشے رکھے بیٹھی تھی۔ اس نے اکثر سنا تھا کہ بعض والدین بچوں کی موت کے صدمے سے کبھی نہیں سنبھلتے۔ وہ ان کے کمرے' ان کی چیزوں کو جوں کا توں چھوڑ دیتے ہیں لیکن اپنے کھوئے ہوئے بچے کو ''تخلیق'' کوئی نہیں کرتا اور وہ بھی ایک بار نہیں ...... بار بار۔ یہ تو بے حد دکھی کر دینے والی بات ہے۔ خوفزدہ کر دینے والی بھی۔

وہ پڑھتی رہی۔

قتل کا وہ کیس پیچیدہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ مختار عظیم نے اعتراف کیا کہ وہ وقوعے والے روز ناشتے پر اس کی نازنین سے لڑائی ہوئی تھی۔ اس نے یہ بھی اعتراف کیا کہ شام چھ بجے وہ گھر آیا تو نازنین گلدان میں پھولوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا کہ یہ پھول کس نے بھیجے ہیں تو اس نے کہا تمہیں اس سے کیا۔ یہ سن کر اس نے کہا' جہنم میں جاؤ تم بھی اور یہ پھول بھیجنے والا بھی۔ میں جا رہا ہوں پھر اپنے بیان کے مطابق وہ اپنے آفس چلا گیا۔ وہاں اس نے شراب پی اور کاؤچ پر پڑ کر سو گیا۔ آدھی رات کے بعد وہ گھر واپس گیا تو نازنین مر چکی تھی۔

لیکن اس کے بیان کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

لفافے میں مقدمے کی کارروائی کا اسکرپٹ بھی تھا۔ وکیل استغاثہ نے اس پر ایسی ظالم جرح کی تھی کہ وہ کنفیوژ ہو گیا تھا۔ اس کے بیان میں تضادات پیدا ہونے لگے۔

لیکن سفینہ کے خیال میں یہ اس کے وکیل صفائی کا قصور تھا۔ اسے اپنے موکل کو اس مرحلے کے لیے پوری طرح تیار کرنا چاہیے تھا۔ استغاثہ کا کیس واقعاتی شہادتوں پر مبنی' لیکن مضبوط تھا۔ اس اعتبار سے ملزم کا گواہوں کے کٹہرے میں آ کر جرم کی تردید کرنا ضروری تھا لیکن اس کے نتیجے میں اظہر عباس جیسے شاطر وکیل کی جرح کا سامنا کرنا بھی ناگزیر تھا اور وہ جرح ملزم کے لیے اعصاب شکن ثابت ہوئی۔ سفینہ کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ مختار عظیم نے اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی تھی۔

فیصلے والے دن جج نے مختار سے پوچھا تھا کہ فیصلہ سنائے جانے سے پہلے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے‘ تو اس نے بس اتنا کہا تھا کہ یہ جرم اس نے نہیں کیا۔ وہ بے قصور ہے۔

جعفر سعید‘ مختار کے وکیل صفائی کے معاون کی حیثیت سے اس روز مختار کے ساتھ تھا۔ سفینہ کا جعفر سے کبھی عدالت میں سامنا بھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ذاتی طور پر وہ اسے جانتی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ پچھلے دس برسوں میں‘ فوج داری مقدمات کے وکیل کی حیثیت سے اس نے اپنی بہت اچھی ساکھ بنائی ہے۔

پھر وہ تراشہ سامنے آیا‘ جس میں فیصلے سے پہلے کہے جانے والے ملزم کے الفاظ شائع ہوئے تھے۔ مختار عظیم نے کہا تھا ’’میں نے نازنین کو قتل نہیں کیا۔ میں نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں نے اسے کبھی دھمکی بھی نہیں دی۔ اس کا باپ ڈاکٹر سلمان جھوٹا ہے۔ میں خدا کو گواہ بنا کر اس عدالت میں حلفیہ اعلان کرتا ہوں کہ ڈاکٹر سلمان جھوٹا ہے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔‘‘

آتش دان کی گرمی سے معمور کمرے کی حدت آگیں فضا میں بھی سفینہ کو تھرتھری چڑھ گئی۔

☆☆☆

سب یہی سمجھتے تھے یا سب کو گمان تھا کہ‘ ارشد جمال کو ترکے میں دولت ملی ہے۔ وہ مرشد آباد میں پندرہ برس سے رہ رہا تھا۔ یہاں آتے ہی اس نے ایک بہت اچھا اور مہنگا مکان خریدا تھا۔

ارشد کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ وہ متوسط قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کا زیادہ وقت گھومتے پھرتے گزرتا تھا۔ وہ شہر شہر گھومتا تھا۔ باتیں بڑی بڑی کرتا تھا۔ خوب صورت چیزوں کا شیدائی تھا۔ اس کے گھر میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر‘ خوب صورت تصاویر اور نوادرات کا ذخیرہ تھا‘ ایسا کہ دیکھ کر دل خوش ہو۔ وہ بہت اچھا اور کشادہ دل میزبان تھا۔ دعوتوں پر دل کھول کر پیسہ خرچ کرتا۔ اس وجہ سے بڑے متمول لوگوں سے اس کے قریبی تعلقات بن گئے تھے۔ دوستوں کو وہ خوش طبع‘ دل میں اتر جانے والا لیکن قدرے پراسرار لگتا تھا۔

لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ خوب صورتی کا شیدائی ارشد جمال ایک پیشہ ور چور ہے۔ کسی کو بھی اس بات کا کبھی خیال نہیں آیا کہ ارشد کا داخلہ جس گھر میں بھی ہوا ہے‘ ایک مناسب وقفے کے بعد اس میں چوری بھی ہوئی ہے۔ اس کے جاننے والوں کا کوئی گھر چوری سے نہیں بچا تھا اور یہ تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ارشد جمال کی صرف ایک شناخت نہیں۔ اس کی کئی شخصیتیں ہیں اور شام نگر کے پہاڑی علاقے میں اس کا ایک خفیہ ٹھکانا ہے۔ وہ اسے دیکھ لیتے تو حیران رہ جاتے۔ نوادرات کے اتنے بڑے ذخیرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی لوٹ مار کا سامان وہیں پہنچاتا تھا۔

مرشد آباد والا مکان اس نے چوری کے پیسے سے ہی خریدا تھا۔ مگر وہاں چوری کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ہاں‘ ہر چیز چوری کے پیسے سے ضرور خریدی گئی تھی۔

کئی بار وہ پکڑے جانے سے بال بال بچا بھی تھا۔ گیارہ سال پہلے گھر میں صفائی کرنے والی ملازمہ کی جیب سے کچھ چیزیں گری تھیں۔ سمیٹتے ہوئے ایک پرچا اس کے ہاتھ میں آنے سے رہ گیا تھا۔ وہ ملازمہ اس علاقے کے بڑے بڑے لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ اس کاغذ کے ٹکڑے پر علاقے کے چار گھروں کے سکیورٹی کوڈ تھے۔ ارشد نے وہ اپنی ڈائری میں نقل کیے اور پرچا دوبارہ ملازمہ کی نوٹ بک میں رکھ دیا پھر اس نے چاروں گھروں کی صفائی کر ڈالی۔ ان میں ایک گھر مختار عظیم کا بھی تھا۔ اس کے گھر والی رات کا تصور کر کے وہ اب بھی کانپ اٹھتا تھا۔

لیکن وہ برسوں پرانی بات تھی اور مختار عظیم اب جیل میں تھا۔ اپنے گھر کی پارٹی میں ارشد نے شگفتہ وقاص کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ’’وقاص مرزا بھی آئیں گے نا؟‘‘ اس نے شگفتہ سے پوچھا۔

’’وہ رات کے کھانے پر امتیاز حیدر کے ساتھ گئے ہیں۔‘‘ شگفتہ نے بڑی رازداری سے بتایا ’’لیکن یہاں تو انہیں آنا ہی پڑے گا۔ مجھے مایوس کرنا ان کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔‘‘

شگفتہ بہت خوبصورت لیکن سرد مزاج عورت تھی اور اس کی فطرت قابضانہ اور حاکمانہ بھی تھی۔ نجانے وقاص مرزا اس کے ساتھ کیسے گزارا کر رہا تھا۔ ارشد کو یقین

تھا کہ وقاص آج اس کے ہاں نہیں آسکے گا۔ امتیاز حیدر برسوں سے اس کے ہاں کی کسی پارٹی میں نہیں آیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نازنین مختار کے قتل کے بعد اس نے اس کے گھر کا رخ کبھی نہیں کیا تھا۔ ہاں ...... گیارہ سال پہلے امتیاز کی ملاقات اسی کے گھر ہونے والی پارٹی میں نازنین سے ہوئی تھی۔

☆☆☆

بدھ۔ 24 اکتوبر!

اظہر عباس غصے میں تھا۔ اس نے سفینہ کو دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ سفینہ پچھتانے لگی۔ اس نے بات کی بھی تو کس سے۔ جس کیس نے اظہر کو شہرت اور عزت دلائی تھی' وہ اس کے متعلق منفی انداز میں سننا کیسے پسند کرسکتا تھا اور وہ بھی اب جبکہ وہ خود کو میئر کے الیکشن کے لیے تیار کر رہا تھا۔

سفینہ نے اخبار کے تراشے رات کو ہی پڑھ لیے تھے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ڈاکٹر سلمان کے سلسلے میں کیا کرے۔ کیا وہ اس سے براہ راست پوچھ لے کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں کو اپنی مقتول بیٹی کا چہرہ کیوں دے رہا ہے لیکن اسے ڈر تھا کہ یہ سن کر ڈاکٹر اسے اپنے مطب سے باہر پھنکوا دے گا اور ہر بات کی تردید کردے گا۔ آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے اظہر عباس سے بات کی جائے۔ آخر وہ اس کیس کا پروسیکیوٹر تھا۔ سو اس نے اظہر کو سب کچھ بتانے کے بعد اس سے پوچھا ''کیا آپ کے خیال میں اس بات کا امکان ہے کہ مختار عظیم کے خلاف گواہی دیتے وقت ڈاکٹر سلمان نے جھوٹ بولا ہو؟''

اور اب اس نے سمجھ لیا تھا کہ اظہر عباس کا ردعمل دوستانہ نہیں ہے۔

''سنو سفینہ' مختار عظیم نے ہی اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔'' بالآخر اظہر نے کہا ''وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے بے وفائی کر رہی ہے۔ اسی روز اس نے اپنے اکاؤنٹنٹ سے طلاق کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ اسے مہر کی بھاری رقم کے علاوہ نان نفقے کے نام پر بھی خطیر رقم ادا کرنا ہوگی تو اس کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ نازنین نے اس سے شادی کی خاطر اپنا ماڈلنگ کا کیریئر چھوڑا تھا اور وہ اس وقت ٹاپ کلاس ماڈل تھی۔ میرا مشورہ ہے کہ بلاوجہ وقت ضائع نہ کرو۔

ڈاکٹر سلمان پر شک کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر سلمان کے ساتھ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔'' سفینہ نے دھیرے سے کہا ''اظہر صاحب' میں قسم کھا سکتی ہوں کہ ڈاکٹر سلمان ایک غم زدہ باپ سے بڑھ کر بہت کچھ ہے۔''

اظہر نے گھڑی کی طرف دیکھا ''سفینہ' ابھی تم نے ایک بڑا کیس نمٹایا ہے اور نجانے کتنے کیس تمہیں نمٹانے ہیں۔ تمہاری جج شپ کا معاملہ زیرغور ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ تمہاری بچی کا علاج نازنین کے باپ نے کیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ کوئی مثالی گواہ نہیں تھا۔ اپنی بیٹی کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے انداز میں جذباتی پن کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ میں نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ جیوری نے اس کی گواہی کو تسلیم کرلیا۔ تو سفینہ تم خود پر مہربانی کرو اور اس معاملے کو بھول جاؤ۔''

اظہر نے اپنے انداز سے جتا دیا کہ اب مزید گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ اپنے دفتر میں واپس آکر سفینہ سوچتی رہی۔ اظہر کا بھڑکنا فطری تھا۔ وہ کیس اس کے لیے ایک تمغے کی طرح تھا۔ اس کے اہم ترین گواہ کو مشتبہ سمجھنا اس کے لیے قابل قبول ہوسکتا تھا اور کون جانے' ڈاکٹر سلمان ایک دکھی باپ کے سوا کچھ نہ ہو' جو اپنی مرحوم بیٹی کو بھول نہیں پا رہا ہو اور کون جانے' مختار عظیم ان بے شمار قاتلوں میں سے ہو' جو مجرم ہوتے ہوئے بھی کہتے ہیں ...... میں بے قصور ہوں۔ میں نے یہ جرم نہیں کیا۔

لیکن سفینہ مطمئن نہیں تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ طوبیٰ کو دوسرے سرجن کو دکھائے گی تو اس سے یہ بھی پوچھے گی۔ کیا آپ نے کبھی دو عورتوں کو ایک ہی چہرہ دینے کے بارے میں سوچا ہے؟ کیا آپ ایسا کرسکتے ہیں؟

☆☆☆

فوجداری وکیل جعفر سعید ساڑھے چھ بجے اپنے دفتر میں پہنچا۔ سب سے پہلے اس نے پیغامات چیک کیے' جو اس دوران میں موصول ہوئے تھے' جب وہ عدالت میں مصروف تھا۔

جعفر کی عمر 38 سال تھی۔ وہ دراز قد اور خوش رو تھا۔ اس نے ابھی تک

شادی نہیں کی تھی۔ لباس اور اپنی ظاہری شخصیت کے بارے میں وہ کافی بے پروا تھا لیکن پیغامات کی تعداد بتاتی تھی کہ وکیل کی حیثیت سے اس کی ساکھ بہت اچھی ہے۔

پیغامات چیک کرتے ہوئے وہ چونکا۔ اسسٹنٹ پروسیکیوٹر سفینہ انصار نے بھی ایک پیغام چھوڑا تھا کہ وہ اس سے رابطہ کرے۔ اس نے اپنے دفتر کا فون نمبر بھی دیا تھا اور گھر کا بھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ ایک بار ایسوسی ایشن کے ڈنر میں اس سے ملا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ جج شپ کی امیدوار ہے۔ اس سے زیادہ وہ اسے نہیں جانتا تھا۔ بہرحال فون تو کرنا چاہیے اور اب وہ دفتر میں نہیں ہوگی۔ وہ سفینہ کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

فون طوبیٰ نے ریسیو کیا۔ سفینہ کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ اسے خوشی ہوئی کیونکہ ابھی دو سال پہلے تک طوبیٰ فون سے گھبراتی تھی۔ ”ممی! آپ کا فون ہے۔“ طوبیٰ نے اسے پکارا۔

اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے کہا ”مس انصار! میں جعفر سعید بول رہا ہوں۔“

سفینہ اضطراری طور پر اس کے لیے پیغام چھوڑ آئی تھی مگر بعد میں وہ شش و پنج میں پڑی رہی کہ شاید اس نے اچھا نہیں کیا۔ اظہر کو مختار کے وکیل صفائی سے اس کا رابطہ شاید پسند نہ آئے۔ ”جعفر صاحب! شاید آپ کو یہ بات غیر متعلق لگے لیکن حال ہی میں میری بیٹی ایک حادثے میں زخمی ہوئی تھی اور ڈاکٹر سلمان احسن نے اس کا علاج کیا تھا۔“ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

”ڈاکٹر سلمان...... نازنین مختار کا باپ؟“

”جی ہاں اور وہاں میں نے ایک عجیب بات نوٹ کی۔“ سفینہ نے اسے نازنین کی ہم شکل دونوں عورتوں کے بارے میں بتایا۔

”وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟“ جعفر کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مجھے بھی یہی بات پریشان کر رہی ہے اور میں اس کیس کی مکمل عدالتی

کارروائی پڑھنا چاہتی ہوں۔“

”آپ کے لیے اس کا حصول کیا مشکل ہے۔“

”اسے پڑھنے میں وقت لگے گا اور میں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ میں اس میں دلچسپی لے رہی ہوں۔“

”اوہ...... آپ فکر نہ کریں۔ وہ میں آپ کے دفتر بھجوا دوں گا۔“

”نہیں۔ گھر بھجوانا زیادہ بہتر ہوگا۔ میرا ایڈریس لکھ لیں۔“

چند لمحے خاموشی رہی۔ جعفر پتا لکھ رہا تھا پھر اس نے کہا ”میں خود حاضر ہوں گا۔ آپ سے بات بھی ہو جائے گی۔ ساڑھے چھ بجے کا وقت مناسب رہے گا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“

”پھر ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ تھینکس۔“

ریسیور رکھتے ہوئے سفینہ سوچ رہی تھی کہ جعفر سعید کا ایکسائٹ منٹ اس کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے ایک ایسے کام کا آغاز کیا ہے، جسے شاید وہ ختم نہیں کر سکے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر سلمان مریضوں سے جلدی فارغ ہو گیا تھا۔ گھر جانے کے بجائے وہ اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی طرف چل دیا، جہاں بابرا ذیشان کام کرتی تھی۔ ایجنسی کے سامنے ریسٹورنٹ تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ ایجنسی کے گیٹ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ وہ اسے باہر نکلتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔

بالآخر بابرا باہر نکلتی نظر آئی۔ ڈاکٹر مسکرانے لگا۔ کتنی خوب صورت لگ رہی ہے وہ۔ اس نے خود کو، اپنے لباس کو، اسٹائل کو اپنے نئے چہرے کے مطابق بنا لیا ہے۔

بابرا نے ٹیکسی روکی۔ ڈاکٹر بل ادا کر کے ریسٹورنٹ سے نکلا اور اپنی کار کی طرف لپکا۔ چند لمحے بعد وہ اپنی گاڑی میں اس ٹیکسی کا تعاقب کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی نیاگرا ریسٹورنٹ کے سامنے رکی۔ شاید بابرا کی کسی سے ملاقات طے تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ریسٹورنٹ میں ہجوم ہوگا۔ وہ وہاں بابرا کی نظر میں آئے بغیر

اسے دیکھ سکے گا۔

لیکن نہیں ...... ڈاکٹر نے سر جھٹکا۔ گھر جانا چاہیے۔ اس کی ایک جھلک ہی کافی ہے۔ بہت کافی۔ ایک لمحے کو تو وہ سمجھا کہ یہ نازنین ہی ہے اور اب ...... اب اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔ سسکیاں اس کے حلق میں گھٹنے لگیں۔ گھر کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بار بار دہراتا رہا۔ سوری نازو ...... آئی ایم سوری۔

☆☆☆

جمعرات۔ 26 اکتوبر!

شاہ زیب کسی سے ملنے کورٹ آیا تھا۔ وہ سفینہ کو لنچ پر لے گیا۔ سفینہ نے اسے ڈاکٹر سلمان اور ہم شکل عورتوں کے بارے میں بتایا۔ اس نے اسے اظہر عباس کے ردعمل کے بارے میں بھی بتایا۔ شاہ زیب فکرمند نظر آنے لگا۔ "سفینہ' مجھے وہ کیس پوری طرح تو یاد نہیں لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم اس میں اپنی ٹانگ نہ پھنساؤ۔ حقیقت پسند بن کر سوچو۔ اس کیس میں کوئی گڑبڑ سامنے آئی تو اظہر کی ساکھ تباہ ہو جائے گی۔ پورا سیاسی سیٹ اپ ڈسٹرب ہوگا ہمارا۔ پریس کہے گا کہ اظہر عباس نے ایک بے قصور شخص کو سزا دلوادی۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"مگر میں اس مفروضے کے تحت کام نہیں کر رہی ہوں۔" سفینہ نے احتجاج کیا "میں محسوس کرتی ہوں کہ ڈاکٹر سلمان کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے اور شاید اس کی وجہ سے اس کی گواہی متاثر ہوئی ہوگی۔ اگر اس نے جھوٹ بولا تھا تو ضروری نہیں کہ مختار مجرم ہو۔ وہ بے قصور بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔" شاہ زیب کے لہجے میں سنگینی تھی۔ "ایسا ہوا تو اظہر کی میئر کے عہدے کے لیے نامزدگی خطرے میں پڑ جائے گی اور تم بھی جج نہیں بن سکو گی۔" وہ کہتے کہتے رکا اور سفینہ کا ہاتھ تھام لیا "کچھ کرنے سے پہلے سوچنا بہت۔ مجھے یقین ہے کہ تم درست فیصلہ کرو گی۔"

☆☆☆

شام کو ٹھیک ساڑھے چھ بجے گھنٹی بجی۔ طوبیٰ دروازہ کھولنے کے لیے لپکی۔ سفینہ نے اسے جعفر کے بارے میں بتا دیا تھا ...... اور یہ بھی کہ وہ ایک کیس کے

بارے میں اس سے تبادلہ خیال کرے گی۔ طوبیٰ نے وعدہ کیا کہ وہ اپنا ہوم ورک خواب گاہ میں مکمل کرے گی۔

طوبیٰ نے جعفر کا تنقیدی جائزہ لیا' پھر پسندیدہ انداز میں مسکرائی "میں طوبیٰ ہوں۔ آپ تشریف رکھیے۔ ممی ابھی آتی ہیں۔"

جعفر کو اس کا انداز بہت پیارا لگا "اور میں جعفر سعید ہوں۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی اور تمہارے چہرے کی خراشوں کا کیا حال ہے؟"

"ڈاکٹر کہتا ہے کہ نشان نہیں رہے گا لیکن مجھے اس ڈاکٹر سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

اسی لمحے سفینہ آ گئی۔ دونوں کے درمیان رسمی گفتگو ہوئی۔ سفینہ نے جعفر کے پھولے ہوئے بریف کیس کو بہت غور سے دیکھا پھر' وہ طوبیٰ کی طرف متوجہ ہوئی "طوبیٰ......"

"مجھے یاد ہے ممی۔ میں ہوم ورک کرنے جا رہی ہوں۔" طوبیٰ نے کہا اور خواب گاہ کی طرف چل دی۔

سفینہ اور جعفر بیٹھ گئے "بہت پیاری بچی ہے۔" جعفر نے کہا۔ "آپ کیا پییں گے' کافی چائے یا......؟"

"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اب کیس پر بات کریں؟"

"ضرور۔"

جعفر نے بریف کیس کھولا "مقدمے کی عدالتی کارروائی ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ سچی بات ہے کہ مجھے اس کیس پر شرمندگی ہے۔ ہم نے مختار کو مناسب تیاری نہیں کرائی تھی۔ دوسری طرف ہم استغاثہ کے گواہوں پر موثر جرح نہیں کر سکے۔ صفائی کی طرف سے ہم صرف دو گواہ پیش کر سکے جبکہ ہمیں کم از کم بیس پیش کرنے چاہیے تھے۔"

"اس کمزوری یا کوتاہی کا کوئی سبب بھی ہوگا۔" سفینہ نے کہا۔

"ظہیر فاروقی بھی بہت اچھے وکیل تھے لیکن جب انہوں نے مختار عظیم کا کیس لیا تو ان کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ ان کا اسپارک ختم ہو چکا تھا۔"

"آپ یہ کمی پوری نہیں کر سکتے تھے؟"
"نہیں۔ میں مبتدی اور ناتجربے کار تھا۔ میری چلتی بھی نہیں تھی۔"
"چنانچہ اظہر عباس نے جرح کے وقت مختار کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔"
"جی ہاں۔ اس نے سب سے پہلے تو مختار سے اعتراف کرایا کہ اسی صبح اس کا نازنین سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے اکاؤنٹنٹ سے طلاق کے سلسلے میں بات کی۔ شام چھ بجے وہ گھر آیا تو نازنین سے دوبارہ لڑائی ہوئی۔ لیب والوں کے اندازے کے مطابق نازنین کو شام 6 بجے اور رات 8 بجے کے درمیان قتل کیا گیا تھا۔ گویا وقوعے کے وقت مختار کی جائے واردات پر موجودگی ثابت ہوگئی۔ مختار کا کہنا ہے کہ وہ اپنے دفتر گیا' شراب پی اور سو گیا لیکن اس بیان کی تائید کے لیے کوئی گواہ نہیں تھا۔ البتہ مجھے اس کی سچائی پر یقین ہے۔" جعفر نے گہری سانس لی۔
"مختار نے بڑی محنت سے اپنے کنسٹرکشن کے کام کو پھیلایا تھا۔ سستے مکانات کے کئی منصوبے مکمل کرنے کے بعد اب وہ کئی شاپنگ پلازہ بنوا رہا تھا۔ وہ بہت محنت کرتا تھا۔ سائٹ پر موجود رہتا۔ اپنی نگرانی میں کام کرواتا۔ اس روز بھی یہی ہوا تھا۔ چھ بجے وہ تھکا ہارا واپس آیا تھا۔"

"نازنین کے بارے میں وہ کیا کہتا ہے؟" سفینہ نے پوچھا۔
"اسے یقین ہے کہ وہ اس سے بے وفائی کر رہی تھی۔" جعفر نے گہری سانس لے کر کہا "شام چھ بجے دوسری بار جھگڑا ہوا۔ وہ گھر پہنچا تو نازنین گلدان میں گلاب کے پھول ارینج کر رہی تھی اور وہ پھول کسی کے بھیجے ہوئے تھے۔ استغاثہ کا کہنا تھا کہ یہ دیکھ کر مختار غصے سے پاگل ہوگیا۔ اس نے گلا گھونٹ کر نازنین کو ختم کیا اور وہی گلاب اس کی لاش پر بکھیر دیے۔ جبکہ مختار کہتا ہے کہ وہ نازنین کو زندہ سلامت چھوڑ کر گھر سے نکلا تھا۔ نازنین اس وقت بھی گلدان سجانے میں مصروف تھی۔"

"پھول والوں کو بھی چیک کیا گیا؟"
"فاروقی صاحب نے کوشش کی تھی لیکن بے نتیجہ رہی۔" جعفر اٹھ کھڑا ہوا۔
"میری یہ خواہش ناروا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کارروائی کے مطالعے کے بعد

آپ میرے ساتھ جیل میں مختار سے ملاقات کریں۔ خود اس سے بات کریں۔ آپ کو اس کی سچائی کا یقین ہو جائے گا۔"
سفینہ اسے چھوڑنے گیٹ تک گئی۔ "میں یہ پڑھنے کے بعد آپ کو فون کروں گی۔" اس نے جعفر کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

عین اسی وقت مختار عظیم جیل میں اپنی کوٹھری میں بیٹھا تھا۔ اس کوٹھری میں اس کی قید کو دس سال ہو چکے تھے۔ ابتدا میں اپنی ہر اپیل کے دوران میں وہ امید اور ناامیدی کے درمیان جھولتا رہتا اور اپیل مسترد ہونے کے بعد مایوسی اس کے وجود کو جکڑ لیتی لیکن اب یہ کیفیت مستقل تھی۔ اس کی ذہنی حالت بہت ابتر تھی۔
کبھی اس کا حال بہتر ہوتا تو وہ گزرے ہوئے برسوں کے بارے میں سوچتا۔ اسے احساس ہوتا کہ شاید وہ پاگل ہوگیا تھا۔ بتول سے اس کی منگنی ہو چکی تھی پھر ایک بار بتول ہی ضد کرکے اسے اپنے بہنوئی کے گھر دعوت میں لے گئی۔ بتول کا بہنوئی ڈاکٹر تھا۔ وہاں ڈاکٹر سلمان اور اس کی بیٹی بھی مدعو تھے۔ وہ نازنین سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ یہ اس کے لیے تباہ کن ہے لیکن پھر بھی وہ نازنین پر مرمٹا۔ اسے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔
اب وہ جاگتی آنکھوں خواب دیکھتا کہ اسے رہائی مل گئی ہے اور وہ دوبارہ مکان تعمیر کر رہا ہے۔ اس کی اسکیچ بک نقشوں اور ڈیزائنوں سے بھری ہوئی تھی۔ جیل میں فرصت کے اوقات میں وہ یہی کچھ کرتا رہتا تھا۔ بتول جب بھی آتی' وہ اسے اپنی اسکیچ بک میں تازہ ترین کام دکھاتا ...... ان پر بات کرتا۔ جیسے سچ مچ اسے آزادی ملنے والی ہے۔ وہ باہر جائے گا اور خوب صورت مکانات تعمیر کرے گا لیکن پھر اسے خیال آتا کہ اس کے رہا ہوتے ہوتے تو دنیا ہی بدل چکی ہوگی۔

☆☆☆

طوبیٰ سو چکی تھی۔ سفینہ مقدمے کی کارروائی کا اسکرپٹ پڑھ رہی تھی۔ وہ نوٹس بھی لے رہی تھی اور ذہن میں اٹھنے والے اعتراضات اور سوالات بھی ایک علیحدہ کاغذ پر لکھ رہی تھی۔ ایک اہم سوال یہ تھا کہ وہ پھول نازنین کو کس نے بھیجے

تھے؟

مختار عظیم کے مکان کے سامنے والے مکان میں اس شام بچوں کو ترسی ہوئی بیوہ عورت فاطمہ موجود تھی۔ اس نے بتایا کہ رات نو بجے اس نے مختار کے گھر کے سامنے ایک کار کھڑی دیکھی تھی۔ جس گھر میں فاطمہ تھی' وہاں اس وقت کوئی تقریب ہورہی تھی لیکن عدالت میں فاطمہ کوئی اچھی گواہ ثابت نہیں ہوئی۔ اظہر عباس نے عدالت کو بتایا کہ فاطمہ اس سے پہلے بھی کئی بار پاس پڑوس میں مشکوک افراد کی موجودگی کی اطلاع پر پولیس کو خبر دیتی رہی ہے مگر ہر بار اس کے شکوک بے بنیاد ثابت ہوئے لہذا وہ ناقابل اعتبار گواہ ہے۔

جس عرصے میں نازنین کا قتل ہوا' اس علاقے میں چوری اور نقب زنی کی پے در پے کئی وارداتیں بھی ہوئی تھیں۔ مختار کا کہنا تھا کہ نازنین کی کچھ جیولری گھر سے غائب ہے لیکن واردات کے بعد قیمتی زیورات کی پوری ایک ٹرے ڈریسر پر رکھی پائی گئی تھی۔ اگر وہ چوری کی واردات ہوتی تو وہ زیورات کیوں ملتے۔

سفینہ سونے کے لیے لیٹی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو اسے ڈاکٹر سلمان سے بات کرنی ہے۔ دوسرے جیل جا کر مختار عظیم سے ملاقات ضروری ہے۔

☆☆☆

ہفتہ۔ 28 اکتوبر!

صبح دس بجے سفینہ اور طوبیٰ ایک مشہور پلاسٹک سرجن کے سامنے بیٹھی تھیں۔ ڈاکٹر جبار کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ ڈاکٹر سلمان کے برعکس وہ خوش مزاج بھی تھا۔ اس نے بڑی عرق ریزی سے طوبیٰ کے چہرے کا معائنہ کیا پھر بولا "یہ خراشیں حادثے کے فوراً بعد خطرناک حد تک سنگین لگ رہی ہوں گی لیکن درحقیقت یہ سطحی نوعیت کی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس بچی کو کوئی مسئلہ درپیش ہے۔"

طوبیٰ یہ سن کر خوش اور مطمئن نظر آنے لگی "شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ ممی ...... اب چلیں؟"

"تم باہر جا کر بیٹھو۔ میں ابھی ایک منٹ میں آتی ہوں۔" سفینہ نے کہا

"مجھے ڈاکٹر صاحب سے ایک بات کرنی ہے۔"

طوبیٰ کو لہجے سے اندازہ ہوگیا کہ اس وقت ممی صرف تعمیل چاہتی ہیں۔ اس نے منہ لٹکا کر کہا "ٹھیک ہے ممی۔" پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

"میں جانتی ہوں کہ باہر مریض اپنی باری کے منتظر ہیں۔ آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔" سفینہ نے ڈاکٹر سے کہا۔ "لیکن مجھے آپ سے ایک ضروری اور اہم بات دریافت کرنی ہے۔"

چند منٹ بعد وہ باہر آئی تو وہ ڈاکٹر جبار کے جواب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا "پلاسٹک سرجن کسی کو کسی کی ناک' کسی کی تھوڑی یا آنکھیں دے سکتے ہیں لیکن کوئی سرجن اپنے کسی مریض کو اپنے کسی شناسا کا چہرہ دے دے تو میرے نزدیک یہ ایک غیر معمولی بات ہوگی۔"

سفینہ نے طوبیٰ کو گھر پہنچایا۔ پانچ منٹ بعد طوبیٰ کی سہیلی سلمیٰ آگئی۔ اسے شام تک طوبیٰ کے ساتھ رہنا تھا۔ سفینہ ان دونوں کو چھوڑ کر نکل آئی۔ اب اسے جیل جانا تھا۔ اس نے جعفر سعید کو پونے دو بجے وہاں ملنے کا وقت دیا تھا۔

☆☆☆

جعفر' سفینہ کا منتظر تھا۔ اس نے مختار سے ملاقات کا وقت لے لیا تھا۔ تین بجے ملاقات ہونا تھی۔ وہ دونوں انتظار گاہ میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ تین بجے ایک گارڈ انہیں مختار سے ملوانے کے لیے لے گیا۔

سفینہ کو یاد تھا کہ مختار دراز قد اور خوب رو جوان آدمی تھا لیکن یہ دس سال پہلے کی بات تھی اور وہ دس سال بھی اس نے جیل میں گزارے تھے۔ اب نجانے وہ کیسا ہو۔ بس عدالت میں اس کے کہے ہوئے آخری الفاظ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ "ڈاکٹر سلمان احسن جھوٹا ہے۔ میں خدا کو گواہ بنا کر اس عدالت میں حلفیہ کہہ رہا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔"

پھر ملاقات کے چھوٹے سے کمرے میں مختار عظیم چلا آیا۔ وہ قیدیوں کے لباس میں تھا۔ وہ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا سفینہ نے اسے دس سال پہلے دیکھا تھا۔ بس اسکے سر میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ اور آنکھوں کے نیچے اور اردگرد لکیروں کا جال بچھ

گیا تھا۔ جعفر نے سفینہ کو اس سے متعارف کرایا تو اس کے ہونٹوں پر ایک پرامید مسکراہٹ چمکی' جسے دیکھ کر سفینہ کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ شخص اس سے آس لگائے بیٹھا ہے!

جعفر نے تمہید میں وقت ضائع نہیں کیا ''مختار ...... میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مس انصار تم سے کچھ سوال کرنا چاہتی ہیں۔''

سفینہ مسکرائی پھر اس نے چھوٹتے ہی وہ سوال کیا جس کی وجہ سے وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ ''ڈاکٹر سلمان نے عدالت میں حلفیہ بیان دیا تھا کہ ان کی بیٹی ...... آپ کی بیوی آپ سے خوفزدہ تھی اور یہ کہ آپ نے اسے دھمکیاں دی تھیں۔ جب کہ آپ اسے جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ڈاکٹر سلمان جھوٹ کیوں بولے گا۔ کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔''

''اگر یہ مجھے معلوم ہوتا تو شاید میں اس وقت یہاں نہ ہوتا۔'' مختار نے پرسکون لہجے میں کہا ''میں نے نازنین کے ساتھ چار سال گزارے۔ اس عرصے میں ڈاکٹر سلمان سے میرا زیادہ واسطہ نہیں پڑا۔ کبھی نازنین اس سے جا کر مل آتی تھی۔ کبھی وہ ہمارے گھر چلا آتا لیکن زیادہ تر ان دنوں جب میں کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر ہوتا۔ ان دنوں میرا کاروبار تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ہفتے میں دو دن مجھے ضرور سفر کرنا پڑتا تھا اور جب بھی میں ڈاکٹر سے ملا تو کبھی مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ مجھے ناپسند کرتا ہے اور نہ ہی ایسا لگا کہ اس کے خیال میں اس کی بیٹی کو مجھ سے جان کا خطرہ ہے۔''

''ڈاکٹر کا اپنی بیٹی کے ساتھ کیسا رویہ تھا؟''

''اس کے انداز سے لگتا تھا کہ نازنین کوئی بے حد مقدس ہستی ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی پجاری کسی دیوی کے روبرو کھڑا ہے۔''

سفینہ کو یہ جواب عجیب سا لگا۔ ایک باپ اور بیٹی کے درمیان ایسا تعلق تو نہیں ہوتا۔

''وہ اس کی فکر بھی بہت کرتا تھا۔'' مختار نے کہا ''ایک بار ہم تینوں کار میں سفر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کو احساس ہوا کہ نازنین نے خود کو سیفٹی بیلٹ سے نہیں باندھا

ہے۔ بس پھر وہ اسے لیکچر دیتا رہا کہ اسے اپنی پروا کرنی چاہیے۔ سچ پوچھیں تو وہ بہت خفا ہوا۔''

سفینہ کو یاد تھا کہ ڈاکٹر نے بالکل اسی طرح اسے اور طوبیٰ کو ڈانٹ پلائی تھی۔

''اور بیٹی کا رویہ ڈاکٹر کے ساتھ کیسا تھا؟''

''وہ اس کا احترام کرتی تھی لیکن آخری دنوں میں اس سے چڑنے لگی تھی۔''

سفینہ نے مزید سوالات کیے۔ اس کے عدالت میں حلفیہ بیان کے حوالے سے۔ اس نے کہا کہ نازنین کو کئی بار ایسے زیورات پہنے دیکھا تھا' جو اس کے دیے ہوئے نہیں تھے۔

''آپ میری ماں سے بات کریں۔ وہ آپ کو بہت کچھ بتا سکتی ہیں۔ ان کے پاس نازنین کی ایک تقریب کے دوران میں لی گئی ایک تصویر تھی جو اخبار میں چھپی تھی۔ اس میں وہ پرانے فیشن کا ہیروں کا نیکلس پہنے ہوئے تھی اور یہ قتل سے صرف دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ نیکلس اور چند اور زیورات جو میرے دیئے ہوئے نہیں تھے قتل والی صبح زیورات کی صندوقچی میں موجود تھے۔ یہ مجھے اس لیے یاد ہے کہ ان کی وجہ سے ہمارے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ یعنی اگلے روز وہ نیکلس اور زیورات صندوقچی میں موجود نہیں تھے۔''

''آپ کا مطلب ہے کوئی زیورات لے گیا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم' کوئی لے گیا تھا یا نازنین نے کسی کو واپس کر دیے تھے' میں یہ کہہ رہا ہوں کہ قتل کے بعد کچھ زیورات غائب تھے۔ میں نے یہ بات پولیس کو بھی بتائی لیکن انہوں نے ابتدا ہی سے میری بات پر یقین نہیں کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ کہتے کہتے رکا ''ایک بات اور ...... میرے ڈیڈی ایک بار جرمنی گئے تھے۔ وہاں سے وہ ایک بہت خوبصورت' بہت چھوٹا سا پکچر فریم لائے تھے۔ شادی کے بعد وہ انہوں نے میری ماں کو تحفے میں دیا تھا۔ ماں نے میری شادی پر وہ نازنین کو دیا تھا۔ بعد میں جب میں نے اور ماں نے نازنین کی چیزیں چیک کیں تو وہ پکچر فریم موجود نہیں تھا۔ جب کہ نازنین کے قتل کی صبح میں نے خود اسے دیکھا تھا۔ وہ کارنر پر موجود تھا۔''

"آپ کہنا چاہتے ہیں کہ نازنین کی موت کے بعد کوئی آیا اور کچھ جیولری اور پکچر فریم چرا کر لے گیا؟" سفینہ نے پوچھا۔

"میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ کچھ چیزیں اسی روز غائب ہوئی ہیں۔"

سفینہ نے اپنے نوٹس پر ایک نظر ڈالی اور مختار کو دیکھا "مختار! آپ کے نازنین سے کیسے تعلقات تھے؟"

"میں جب اس سے ملا تو پہلی ہی نظر میں اس پر فدا ہو گیا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ وہ ایسی تھی کہ اس کے ساتھ آدمی خود کو بڑا محسوس کرنے لگتا لیکن شادی کے بعد......" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا "تب پتا چلا کہ وہ جھلسا دینے والی آگ ہے۔ روح کو گرما دینے والی حدت نہیں۔ مجھے میرے ماں باپ نے سکھایا تھا کہ شادی بہت مقدس رشتہ ہے اور طلاق صرف آخری راستہ ہے' جب باقی تمام راستے بند ہو چکے ہوں۔ بے شک ہم نے اچھا وقت بھی گزارا لیکن کیا مجھے خوشی ملی؟ نہیں مگر میری کاروباری مصروفیات اتنی تھیں کہ میں اس بارے میں سوچ نہیں سکا مگر نازنین خوش تھی۔ لگتا تھا' اسے وہ سب کچھ مل گیا ہے' جو وہ چاہتی تھی۔ دولت کا بہاؤ ہماری طرف تھا۔ وہ روز کلب جاتی تھی۔ میں نے اس کے لیے اس کے خوابوں کا گھر تعمیر کیا۔ وہ دو سال تک اسے سجانے میں لگی رہی۔ اس شہر میں ارشد جمال نامی ایک شخص ہے' جسے نوادرات کا شوق ہے اور آرائشی اشیا کی تمیز ہے۔ نازنین اس کے ساتھ جاتی تھی اور اس کے مشورے سے شاپنگ کرتی تھی۔ خریداری کا اسے بہت زیادہ خبط تھا۔ وہ سب کچھ خرید لینا چاہتی تھی۔ وہ ان تقاریب میں جانا ضروری سمجھتی تھی' جن کی کوریج پریس والے کر رہے ہوں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کی تصویر اخباروں میں چھپے۔" اس نے گہری سانس لی "میں سمجھتا تھا کہ وہ خوش ہے لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ میں اس کی مجبوری تھا۔ کوئی مجھ سے بہتر' مجھ سے زیادہ دولت مند مل جاتا تو......

"اور پھر شاید ایسا کوئی اسے مل گیا۔ وہ اسے اہمیت بھی دینے لگی اور صبح میں نے وہ زیورات دیکھے' جو میں نے اسے نہیں دیے تھے۔ ان میں کچھ جدید طرز کے تھے اور کچھ نوادرات میں سے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسے اس کے باپ نے

دیے ہیں مگر مجھے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اب بہر حال تمام زیورات اس کے باپ کے پاس ہیں۔ وہ بھی جو میں نے اسے دیے تھے۔"

گارڈ نے اشارہ کیا کہ ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ مختار اٹھا۔ اس نے سفینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "مس انصاری! میں اس سزا کا حق دار نہیں ہوں اور نازنین کا قاتل آزاد ہے اور کہیں نہ کہیں کوئی ثبوت ضرور موجود ہوگا' کوئی سراغ ضرور ہوگا' جس سے یہ بات ثابت ہوگی۔"

مختار چلا گیا۔ سفینہ' جعفر کے ساتھ باہر نکل آئی "کیا خیال ہے آپ کا؟" جعفر نے پوچھا۔

"مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آئی' جس کے تحت یہ سوچا جا سکے کہ ڈاکٹر سلمان نے جھوٹ بول کر مختار کو پھنسا دیا۔ خود مختار کا یہی کہنا ہے کہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کا تعلق نارمل تھا۔ مختار نے یہ بھی کہا کہ اسے یقین نہیں کہ دوسرے زیورات نازنین کو اس کے باپ نے نہیں دیے تھے تو جعفر صاحب' یہ بھی ممکن ہے کہ مختار جیلس ہو۔ حسین عورتوں کے شوہر عام طور پر جیلس ہوتے ہیں۔"

☆☆☆

اتوار۔ 29 اکتوبر۔

سفینہ اپنے جج شپ کے خواب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شاہ زیب نے ٹھیک کہا تھا۔ اظہر عباس کو عوام کی نظروں میں ہلکا کرنے کا مطلب اپنی جج کی حیثیت سے تقرری کے امکانات سے ہاتھ دھو لینے کے مترادف ہے۔ اس کا جیل میں جا کر مختار سے ملاقات کرنا بہت بڑی غلطی تھی۔ ایک بار جذباتی غلطی کی وجہ سے وہ نقصان اٹھا چکی تھی۔ دوسری بار کیوں ایسا کیا جائے۔

وقاص کے معاملے میں اس سے بڑی جذباتی حماقتیں سرزد ہوئی تھیں۔ پہلے تو اس نے اس سے محبت کی پھر جب وہ اسے چھوڑ گیا تو اسے اس پر غصہ آیا اور وہ اس بات پر کڑھتی رہی کہ وہ اس کی موقع پرست فطرت کو کیوں نہیں سمجھ سکی تھی۔ اگر وقاص وہ ہوتا جو اسے سمجھتی تھی تو اب تک ان کی ازدواجی زندگی نو برس پر محیط ہوتی اور اس کے بچے بھی ہوتے۔ وہ ہمیشہ سے تین بچوں کی خواہش مند تھی۔

لیکن طوبیٰ کو دیکھ کر اس کے دل میں شکر گزاری کا احساس جاگتا تھا۔ طوبیٰ

بہت پیاری بچی تھی۔ ایک بہت بڑی نعمت۔ کیا ہوا اگر اس کی شادی ناکام ہو گئی۔ یہ تجربہ لاحاصل تو نہیں رہا۔ طوبیٰ اسی کا ثمر ہے پھر ناشکرا پن کیوں کیا جائے۔

یہ سوچتے ہوئے اسے نازنین اور ڈاکٹر سلمان کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو بیٹی اور باپ تھے۔ ڈاکٹر سلمان نے عدالت میں بتایا تھا کہ اس سے طلاق کے بعد اس کی بیوی جام پور چلی گئی تھی اور وہاں اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔ نازنین اس کی اجازت سے اپنی ماں کی تحویل میں تھی اور سوتیلے باپ کے گھر رہتی تھی۔ ڈاکٹر کے خیال میں اسی میں اس کی بیٹی کی بہتری تھی۔ ''لیکن اپنی ماں کی موت کے بعد وہ میرے پاس واپس آ گئی۔'' ڈاکٹر نے کہا تھا ''اسے میری ضرورت تھی۔''

مختار نے کہا تھا کہ ڈاکٹر سلمان اپنی بیٹی کو پرستش کی حد تک چاہتا تھا۔ یہ بات سننے کے بعد ایک سوال سفینہ کے ذہن میں چبھتا رہا تھا۔ ڈاکٹر سلمان نے اپنے ہنر کو کام میں لاتے ہوئے اور عورتوں کو نازنین جیسا بنا دیا تھا۔ لیکن کسی نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ کیا اس نے نازنین کا آپریشن بھی کیا تھا؟

اس نے طوبیٰ کے ساتھ کھانا کھایا۔ وہ کھانے سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ وقاص کا فون آ گیا۔ وہ طوبیٰ کو رات کے کھانے پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ شگفتہ بچوں کو لے کر ایک ہفتے کے لیے آکاش نگر گئی ہوئی ہے۔

طوبیٰ کو خوش دیکھ کر سفینہ نے اسے اجازت دے دی۔ اس نے سوچا یوں اسے مختار کیس کے مطالعے کے لیے وقت مل جائے گا۔

☆☆☆

جعفر سعید فٹ بال کا شوقین تھا۔ اس وقت وہ فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سفینہ نے مختار کیس کی فائل پڑھ بھی لی ہے یا نہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ مختار سے ملاقات کا انتظار کرتے ہوئے شاید وہ اس موضوع پر بات کرے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سفینہ کے پیشے کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی پر یقین نہیں کرے لیکن مختار سے ملاقات کے بعد اس کا منفی رویہ یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ اس کیس سے ہاتھ اٹھا رہی ہے۔

آخری منٹ پر گول ہوا اور جعفر کی پسندیدہ ٹیم جیت گئی لیکن وہ دوستوں کے

ساتھ کافی پینے نہیں گیا۔ اس نے اپنے گھر کا رخ کیا اور وہاں سے سفینہ کو فون کیا۔

یہ سن کر اسے خوشی ہوئی کہ سفینہ پوری فائل پڑھ چکی ہے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک بار اور مل بیٹھیں۔'' اس نے کہا پھر اس نے سوچا چاہے وہ انکار کر دے لیکن پیش کش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ ''کیوں نہ ہم رات کے کھانے پر یکجا ہو جائیں۔'' اس نے اضافہ کیا۔

☆☆☆

فاطمہ ساٹھ سال کی عمر میں اپنی بیٹی کے پاس واپس آئی تھی۔ یہ بارہ سال پہلے کی بات ہے جب وہ بیوہ ہوئی تھی۔ وہ خود کو بیٹی پر مسلط نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کا وہ کیا کرتی کہ وہ تنہائی سے خوف زدہ تھی۔ درحقیقت تنہائی اسے نروس کر دیتی تھی۔ بچپن میں ایک بار اس نے دروازہ کھولا تو ایک ڈاکو اندر گھس آیا تھا۔ اس نے اسے اور اس کی ماں کو باندھ کر نہایت اطمینان سے گھر کا صفایا کیا تھا۔ وہ فاطمہ کے لیے ایک ایسا ڈراؤنا خواب تھا جسے وہ کبھی نہیں بھولی۔ اس کے نتیجے میں وہ اتنی وہمی ہو گئی تھی کہ یہاں گھر میں اکیلی ہوتے ہوئے کئی بار اس نے خواہ مخواہ الارم کا بٹن دبا دیا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے داماد کو بڑی شرمندگی ہوئی اور وہ اس پر خفا بھی ہوا تھا۔

اس کی بیٹی صبا اپنے شوہر حفیظ کے ساتھ کثرت سے سفر کرتی تھی۔ جب کہ بچے گھر پر ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے فاطمہ کا وجود ان کے لیے غنیمت تھا۔

ایک بار بچے بھی تفریح کے لیے بیرون شہر گئے ہوئے تھے۔ پڑوس کے لوگوں کو کہیں جانا تھا تو وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے فاطمہ کو اپنے گھر چھوڑ گئے۔ اس کے بعد وہ جب بھی ضرورت پڑتی فاطمہ کی خدمات حاصل کرتے۔ فاطمہ بھی بچوں میں بہت خوش ہوتی تھی۔ بس ایک بار وہ لوگ بھی خفا ہوئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک مشکوک آدمی کو دیکھ کر پولیس کو فون کر دیا اور اس کا شبہ بعد میں بے بنیاد ثابت ہوا تھا لیکن پچھلے دس سال میں اس نے اس غلطی کا اعادہ نہیں کیا تھا۔ آخری غلطی اس نے خانم قتل کیس میں گواہی دے کر کی تھی۔ اس واقعے کو یاد کر کے وہ کانپ اٹھتی تھی۔ پروسیکیوٹر نے اسے خوب مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کی بیٹی اور

داماد اس پر بات پر ناراض ہوئے تھے۔ صبا نے کہا تھا "امی...... میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ پولیس سے بات نہ کریں۔"

لیکن فاطمہ مختار کو جانتی تھی اور مختار اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتی تھی اور وہ کار تو اس نے خود دیکھی تھی۔ صرف اس نے نہیں پانچ سالہ احمر نے بھی دیکھی تھی۔ اس رات وہ احمر کی دیکھ بھال کے لیے اس کے ساتھ تھی۔ احمر ذہنی اعتبار سے کمزور بچہ تھا۔ وہ اپنی عمر کے بچوں کی طرح آسانی سے سیکھ اور سمجھ نہیں سکتا تھا۔

فاطمہ نے اس کار کی نمبر پلیٹ کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اسے یاد تھا کہ نمبر پلیٹ پر M اور 3 ضرور موجود تھا۔ عدالت میں پروسیکیوٹر نے کافی فاصلے سے ایک نمبر پلیٹ دکھائی تھی اور وہ اسے پڑھ نہیں سکی تھی اور پروسیکیوٹر نے اس سے یہ اعتراف بھی کرا لیا تھا کہ وہ مختار کو پسند کرتی تھی۔ مختار نے کئی موقعوں پر اس کی مدد کی تھی۔

اب یہ فاطمہ ہی سمجھ سکتی تھی کہ ذاتی پسند اور ناپسند سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر اسے یہ احساس ہوتا کہ مختار قاتل ہے تو اپنی ذاتی پسند کو ایک طرف رکھ دیتی لیکن اسے پورا یقین تھا کہ مختار عظیم بے قصور ہے۔ اب بھی کبھی وہ اس دن کو یاد کرتی' جب وہ مختار کے سامنے والے مکان میں احمر کی دیکھ بھال کے لیے ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ اس رات کی بات ہے' جب نازنین کو قتل کیا گیا تھا۔ اب تو احمر کی فیملی بھی شہر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اس رات احمر نے اس کار کو دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا "پاپا کی کار!"

اب اس وقت یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے فاطمہ کو معلوم بھی نہیں تھا کہ دس میل دور ایک مکان میں مختار کا وکیل جعفر سعید اور اسسٹنٹ پروسیکیوٹر سفینہ انصار بیٹھے اسی کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔

☆☆☆

کھانے کے دوران میں انہوں نے کیس پر بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ کافی آگئی۔ کھانے کے دوران میں جعفر اسے اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا رہا۔

"مجھے تم پر رشک آ رہا ہے۔" سفینہ نے جعفر کی چار بہنوں اور ان کی پیار بھری لڑائیوں کا تذکرہ سننے کے بعد کہا "میں تو اکلوتی تھی۔ دل گھبراتا تھا تو پڑوسیوں کے گھر چلی جاتی۔ ان کے سات بچے تھے۔ مجھے وہاں بہت اچھا لگتا تھا۔ میں سولہ سال کی تھی تو ابو کا انتقال ہو گیا۔ امی نے دوسری شادی کر لی۔ میں یہاں چلی آئی۔ اب میں امی سے ملنے کے لیے سال میں دو بار سعید آباد جاتی ہوں۔"

جعفر کی آنکھوں سے نرمی جھلکنے لگی "تو تمہیں فیملی سے تو کوئی مدد نہیں ملی ہو گی؟"

"یہ تو ہے لیکن شاہ زیب انکل اور تمکنت آنٹی سے مجھے بہت مدد ملی ہے۔ انہوں نے یہ خلا بھر دیا وہ میرے ماں باپ کی طرح ہیں۔"

کافی آئی تو گفتگو کا رخ مختار کے کیس کی طرف مڑ گیا۔ سفینہ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "دس سال پہلے جب اس مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا تو میں عدالت میں موجود تھی۔ مختار کے چہرے پر تاثر اور اس کے کہے ہوئے الفاظ میری یادداشت پر نقش ہیں۔ میں نے بے شمار مجرموں کو بے گناہی کا دعویٰ کرتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے لیکن مختار میں کوئی ایسی بات تھی...... شاید سچائی' جس نے میرے دل کو چھو لیا۔"

"یہی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سچ بول رہا تھا۔" جعفر نے کہا۔

سفینہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میں صاف بات کروں گی۔ کیس کی تفصیل پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں کئی سوالات نے سر اٹھایا لیکن مجھے مختار کی بے گناہی کا یقین نہیں آ سکا ہے۔ کل مختار سے ملاقات بھی مجھے قائل نہیں کر سکی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس روز نازنین قتل ہوئی' مختار نے اسی روز طلاق کے امکانات پر تبادلہ خیال کیا اور اسے پتا چلا کہ طلاق اسے بہت مہنگی پڑے گی۔ یہ حقیقت مختار کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔"

"سنو سفینہ' نازنین تو یوں بھی مختار کو مہنگی ہی پڑی تھی۔ وہ پیسہ پانی کی طرح بہاتی تھی۔" جعفر نے کہا اور ذرا توقف کے بعد بولا "غصے میں اظہار کرنا' اور غصے میں قتل کر دینا' ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مختار کو طلاق مہنگی پڑنے کے باوجود اس

بات کی خوشی تھی کہ اسے اذیت ناک ازدواجی زندگی سے چھٹکارا مل جائے گا اور وہ اپنی زندگی از سرِ نو شروع کر سکے گا۔"

پھر پھولوں کا تذکرہ چھڑ گیا "مجھے یقین ہے کہ نہ مختار وہ پھول لایا تھا اور نہ اس نے بھجوائے تھے۔" جعفر نے کہا "اور اگر اسے سچ مان لیا جائے تو ایک آدمی کا وجود ثابت ہو جاتا ہے۔"

جعفر نے بل ادا کیا۔ اٹھتے اٹھتے دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ ڈاکٹر سلمان کی گواہی نے مختار کو سلاخوں کے پیچھے پہنچایا ہے "اب سوچو۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ نازنین مختار کی قابضانہ فطرت کی وجہ سے خوف زدہ تھی لیکن نازنین کا یہ عالم تھا کہ وہ مختار کے سامنے کھڑی ایک اور مرد کے بھیجے ہوئے پھولوں کو ارینج کرتی رہی۔ کیا خوف زدہ عورتیں ایسی ہوتی ہیں پھر کسی اور نے ڈاکٹر سلمان کے بیان کی تائید میں شہادت نہیں دی۔ نازنین اور مختار کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ اگر مختار مار پیٹ کا عادی ہوتا تو کوئی گواہ ضرور یہ بات لے کر آگے آتا۔"

"لیکن عدالت کو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آئی، جس کے تحت ڈاکٹر سلمان نے عدالت میں جھوٹ بولا ہو۔"

واپس جاتے ہوئے ان کے درمیان خاموشی رہی۔ سفینہ کے گھر کے دروازے پر رخصت ہوتے ہوئے جعفر نے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے؟"

"میں پہلی فرصت میں ڈاکٹر سلمان سے ملاقات کروں گی۔"

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔" جعفر نے واپسی کے لیے پلٹتے ہوئے کہا۔

سفینہ گھر میں چلی گئی۔ وہ جعفر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ کتنا اچھا انسان ہے۔ اس نے گھر میں آنے کی خواہش بھی نہیں کی اور وہ کتنی بد اخلاق ہے کہ اس نے مروتاً بھی اسے اندر نہیں بلایا۔

☆☆☆

طوبیٰ کو وقاص کا ساتھ بہت اچھا لگتا تھا۔ اسے باپ کی قربت زیادہ نہیں ملی تھی مگر وہ قربت بہر حال بے حد پُر لطف ہوتی تھی۔

وہ سفاری پارک ہو کر آئے تھے اور اب ریسٹورنٹ میں بیٹھے کھانا کھا رہے

تھے "ہم پھر ملیں گے۔" وقاص نے کہا "تمہاری مما کسی کے ساتھ گھومنے جائیں تو موقع مل جائے گا۔ میں تمہیں فن کلب لے کر چلوں گا۔"

"ممی کب کہیں جاتی ہیں۔" طوبیٰ نے مایوسی سے کہا "ہاں، کل ایک وکیل ہمارے گھر آیا تھا۔ مجھے وہ اچھے لگے لیکن تمام وقت کسی کیس پر باتیں ہوتی رہیں۔"

اس سے پہلے وقاص بے دھیانی سے سن رہا تھا۔ اچانک وہ پوری طرح بیٹی کی طرف متوجہ ہو گیا "اس کا نام کیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"جعفر سعید۔ وہ ممی کے لیے ایک فائل لائے تھے جو ممی کو پڑھنی تھی۔"

وقاص اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ طوبیٰ کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے تذکرہ کر کے ڈیڈی کو خواہ مخواہ اداس کر دیا اور اب شاید ڈیڈی اس سے خفا بھی ہیں۔ گھر پہنچانے کے بعد ڈیڈی خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ طوبیٰ نے بھی سکون کی سانس لی۔

☆☆☆

پیر 30 اکتوبر۔

پیر کی صبح سفینہ نے ڈاکٹر سلمان کے آفس فون کیا۔ صالحہ وہاب نے فون ریسیو کیا۔ ''مجھے ڈاکٹر سے بات کے لیے جلد از جلد وقت چاہیے۔ بہت اہم معاملہ ہے۔'' سفینہ نے کہا۔

سفینہ نے تکا لگایا ''ان سے کہیے گا کہ مجھے نازنین کے بارے میں بات کرنی ہے۔''

پانچ منٹ کے انتظار کے بعد ریسیور پر ڈاکٹر کی سرد آواز ابھری۔ ''تم کیا چاہتی ہو مس انصار؟'' لہجہ بھی سرد تھا۔

''ڈاکٹر میں آپ سے مختار عظیم کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں اور یہ جتنا جلدی ہو جائے بہتر ہے۔''

ریسیور رکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔ ڈاکٹر نے اسے اگلی صبح ساڑھے سات بجے کا وقت دیا تھا۔ طوبیٰ کے اسکول کا مسئلہ تھا۔ پڑوسیوں سے مدد لینی پڑے گی ورنہ طوبیٰ دوبارہ سو جائے گی۔ ناشتہ تو وہ خود کر سکتی تھی اور اسکول وہ اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ جاتی تھی۔

سفینہ نے یونس نصیر سے بات کی ''مجھے غیر سرکاری طور پر تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا پھر اسے نازنین کی ہم شکل عورتوں اور ڈاکٹر سلمان کے بارے میں بتایا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ جیل جا کر مختار عظیم سے ملاقات کر چکی ہے اور اسے اس کیس میں گڑ بڑ محسوس ہوتی ہے۔

یونس سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔

''یہ بات میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ اظہر میری اس کیس میں دلچسپی

پر بہت ناخوش ہیں۔''

''اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''اہم بات یہ ہے کہ خود اظہر صاحب نے ڈاکٹر سلمان کو ایک غیر جذباتی گواہ قرار دیا ہے۔ ایک ایسے شخص کے معاملے میں جس کی بیٹی قتل ہو گئی ہو' یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ ڈاکٹر نے اپنی گواہی میں بتایا کہ نازنین چھوٹی ہی تھی کہ اس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہو گئی پھر نازنین اپنی ماں کی موت تک اپنے سوتیلے باپ جبار احمد کے پاس رہی۔ جبار احمد جام پور میں رہتا ہے۔ اب میں نازنین کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں کہ بچپن میں وہ کیسی تھی۔ اس کی لڑکپن کے زمانے کی کوئی تصویر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔''

اس نے کیس فائل کے کچھ منتخب صفحات یونس کی طرف بڑھائے ''اس میں ایک گواہ خاتون کا بیان ہے' جس نے وقوعے کی رات مختار ہاؤس کے باہر ایک سیاہ گاڑی دیکھی تھی۔ تم ذرا اس گواہ کو چیک کر کے دیکھو۔''

یونس نصیر کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک واضح طور پر نظر آ رہی تھی ''میں یہ کام خوشی سے کروں گا۔ ہمارے لیڈر اظہر عباس کو بھی کچھ تو پسند آئے۔''

''دیکھو یونس' اظہر اچھے آدمی ہیں۔'' سفینہ نے احتجاج کیا۔ ''میں ان کی راہ کھوٹی نہیں کرنا چاہتی لیکن ایک معصوم آدمی اگر جیل میں سڑ رہا ہے تو اسے آزاد کرانے کی کوشش کرنا میں ضروری سمجھتی ہوں۔''

''مجھے غلط نہ سمجھو۔ مجھے بھی اظہر سے کوئی پرخاش نہیں۔'' یونس نے جلدی سے کہا ''لیکن وہ اپنے اسٹاف کی پروا نہیں کرتا۔ اسے صرف اپنی فکر رہتی ہے۔ وہ خود غرض آدمی ہے۔''

☆☆☆

شام کو سیکریٹری نے جعفر کو انٹر کام پر بتایا کہ بتول اس...... سے ملنا چاہتی ہے ''وہ کہتی ہے کہ بہت اہم بات ہے۔'' سیکریٹری نے کہا۔

جعفر کو تشویش ہونے لگی۔ بتول پیشگی اطلاع کے بغیر کبھی نہیں آتی تھی۔ ضرور کوئی اہم بات ہے۔

بتول اندر آئی تو جعفر نے کھڑے ہو کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے سوچا کہ اگر مختار نے نازنین کے چکر میں پھنسنے کے بجائے بتول سے شادی کر لی ہوتی تو اس کی زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ یہ بات وہ ہمیشہ سوچتا تھا۔ بتول کو دیکھ کر ہر بار اسے یہی خیال آتا تھا۔

بتول تقریباً مختار سے کم عمر تھی۔ پندرہ سال پہلے مختار سے اس کی منگنی ہوئی تو وہ ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ بعد میں اس نے ایم اے کر لیا تھا اور اب ایک پرائیوٹ اسکول میں پرنسپل تھی۔

اس وقت اس کے چہرے پر فکرمندی جھلک رہی تھی ''آج میں مختار سے ملنے گئی تھی۔ وہ تو بالکل امید کھو بیٹھا ہے۔'' اس نے بیٹھتے ہی کہا ''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ ایک امید پر جی رہا ہے کہ کبھی اس کی دوبارہ سماعت کی اپیل منظور ہو گی اور اسے رہائی مل جائے گی مگر مسلسل اپیلیں مسترد ہونے کے بعد وہ حوصلہ ہار رہا ہے۔ اس نے مجھے اس اسسٹنٹ پروسیکیوٹر سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔ اس کے خیال میں خاتون کو اس کی بے گناہی پر یقین نہیں آیا۔''

''وہ خودکشی کی طرف تو مائل نہیں ہو رہا؟''

''ایسی بات نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اسے کھو کر اس کی ماں جی نہیں سکے گی۔''

مختار کی ماں صدیقہ بیگم کو پہلا دورہ اس وقت پڑا تھا جب مختار کو سزا سنائی گئی تھی۔ دوسرا دورہ اب پانچ سال پہلے پڑا تھا۔

''مجھے بتایئے، میں اسے کیسے امید دلاؤں؟'' بتول نے پوچھا ''امید کے بغیر وہ جی نہیں جسکے گا۔''

بتول نے یہ بات ایک ہفتے پہلے پوچھی ہوتی تو جعفر کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ہوتا لیکن اب سفینہ کی وجہ سے معاملہ مختلف تھا لیکن وہ ضرورت سے زیادہ حوصلہ افزائی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے سفینہ کے، ڈاکٹر کے مطب سے نکلنے والی نازنین کی ہم شکل عورتوں کے اور اس کیس میں سفینہ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے متعلق بتایا۔

بتول کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''تو سفینہ انصار اب بھی اس کیس میں دلچسپی

لے رہی ہے؟''

''بالکل لے رہی ہے اور بتول، وہ بے حد شاندار عورت ہے۔'' جعفر نے کہا۔ اس وقت وہ تصور میں سفینہ کو دیکھ رہا تھا۔

''جعفر صاحب، پچھلی اپیل میں بھی آپ نے میرے متعلق عدالت کو نہیں بتایا۔ سوچ لیں، کہیں ہم غلطی تو نہیں کر رہے ہیں؟''

مقدمے کے دوران میں جعفر کو سینئر وکیل ظہیر فاروقی کے اس موقف سے اتفاق تھا کہ اگر انہوں نے بتول کو گواہوں کے کٹہرے میں بلا لیا تو وہ مختار کے لیے دو دھاری تلوار ثابت ہو گی۔ استغاثہ اس تعلق کو قتل کا محرک بنا کر پیش کرے گا جب کہ تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ بتول کی گواہی ڈاکٹر سلمان کی گواہی کا توڑ ثابت ہو سکتی تھی، جس نے مختار کو ایک حاسد اور جیلس شوہر کے روپ میں پیش کیا تھا۔

جعفر کا خیال تھا کہ انہوں نے درست فیصلہ کیا لیکن سفینہ سے ڈاکٹر سلمان اور اس کے مطب سے نکلنے والی نازنین کی ہم شکل عورتوں کے بارے میں سننے کے بعد اس کی رائے متزلزل ہو گئی تھی۔ اس نے بتول کو بغور دیکھتے ہوئے کہا ''میں چاہتا ہوں کہ تم سفینہ سے مل لو اور اسے سب کچھ بتا دو۔ اگر ہمیں ایک اور اپیل کا موقع ملتا ہے تو ہمیں ہر زاویے سے سوچ بچار کرنی ہو گی۔ ہر پہلو سامنے رکھنا ہو گا۔''

☆☆☆

منگل 31 اکتوبر۔

سفینہ صبح سویرے ڈاکٹر سلمان سے ملاقات کے لیے تیار ہوئی۔ اس نے طوبیٰ کو زبردستی جگایا۔ جو اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی ''اٹھو بیٹا'' تم ہمیشہ مجھ سے شکایت کرتی ہو کہ میں تمہیں چھوٹا سا بچہ سمجھتی ہوں۔'' طوبیٰ منمنائی۔

''آج میں تمہیں موقع دے رہی ہوں۔ تم ثابت کر دو کہ تم بڑی ہو گئی ہو۔ برابر والی صغریٰ خالہ سات بجے فون کر کے تمہیں جگائیں گی۔ تم اٹھ جانا۔ دوبارہ سو نہ جانا۔ تمہارا ناشتا تیار ہے۔ وہ کرنا اور اسکول چلی جانا۔''

طوبیٰ نے جماہی لی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ نیند میں تھی۔ ''طوبیٰ پلیز'' سفینہ نے پھر اپیل کی۔ اس بار طوبیٰ نے آنکھیں کھولیں اور انہیں ہتھیلیوں سے

ملنے لگی۔

سفینہ نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا" میری باتیں غور سے سنو اور یاد بھی رکھنا۔ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھولنا۔"

"ٹھیک ہے مما۔"

"مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ ایلس دو بجے گھر پہنچ جائے گی۔" سفینہ نے کہا ایلس پڑوس کی بچی تھی جب سفینہ دیر سے آتی تھی وہ گھر میں طوبیٰ کے ساتھ رہتی۔

"ٹھیک ہے مما۔ خدا حافظ۔"

طوبیٰ ماں کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنتی رہی پھر وہ یہ سوچ کر بستر پر لیٹ گئی کہ میں ایک منٹ بعد اٹھ جاؤں گی۔

سات بجے ٹیلی فون کی چھٹی گھنٹی پر اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے اٹھ کر فون ریسیو کیا" جی صغریٰ خالہ میں جاگ چکی ہوں۔ آپ کا شکریہ" اور وہ بستر سے نکل آئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر سلمان نے خود سفینہ کے لیے دروازہ کھولا لیکن اس کا رویہ پہلے سے بھی خراب تھا۔" میں تمہیں صرف بیس منٹ دے سکتا ہوں مس انصار۔ اس سے ایک سیکنڈ زیادہ نہیں۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

سفینہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا" ڈاکٹر میں نے دو ایسی عورتوں کو آپ کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا' جو بالکل آپ کی بیٹی نازنین کی ہم شکل تھیں۔ قدرتی طور پر انہیں دیکھ کر مجھے تجسس ہوا۔ اس کے نتیجے میں' میں نے اس کے قتل کے کیس کی پوری فائل بڑی توجہ سے پڑھی۔"

ڈاکٹر سلمان کے چہرے پر نفرت کا واضح سایہ سا لہرا گیا۔

"ڈاکٹر آپ کی گواہی کی وجہ سے مختار عظیم کو سزا ہوئی۔"

سفینہ نے مزید کہا" آپ نے کہا کہ وہ حاسد تھا۔ اس میں رقابت کا جذبہ بہت شدید تھا اور اس وجہ سے آپ کی بیٹی اس سے خوف زدہ رہتی تھی جب کہ مختار

حلفیہ کہتا ہے کہ اس نے نازنین کو کبھی دھمکی نہیں دی۔"

"وہ جھوٹ بول رہا ہے۔" ڈاکٹر نے بے حد غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

"لیکن اگر نازنین کو اپنے شوہر سے جان کا خوف تھا تو وہ اس کے ساتھ کیوں رہتی رہی؟"

صبح کی دھوپ کمرے میں بھر آئی۔ ڈاکٹر کی عینک کے شیشوں پر دھوپ پڑی اور سفینہ...... کو اس کی آنکھیں نظر نہیں آئیں۔ وہ ان کے تاثرات نہیں دیکھ سکی" اس لیے کہ وہ اپنی ماں جیسی نہیں تھی۔ وہ شادی کو اہمیت دیتی تھی۔" ڈاکٹر نے کہا" اس کی زندگی کی بدترین غلطی مختار سے محبت تھی اور اس سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے مختار کی دھمکیوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔"

سفینہ کو احساس ہوا کہ گفتگو لاحاصل ثابت ہو رہی ہے۔ اسے وہ سوال کرنے چاہیے تھے جو اس کے ذہن میں پہلے ابھرے تھے۔" ڈاکٹر' آپ نے کبھی اپنی بیٹی کے چہرے پر بھی سرجری کی تھی؟"

اس سوال نے ڈاکٹر سلمان کو برافروختہ کر دیا" مس انصار' میں ان ڈاکٹروں میں سے ہوں' جو غیر معمولی صورت حال درپیش نہ ہو تو گھر کے افراد کا علاج خود بھی نہیں کرتے۔ اور اس سے ہٹ کر بھی یہ سوال توہین آمیز ہے۔ میری بیٹی پیدائشی طور پر حسین تھی۔"

"آپ نے کم از کم اپنی دو مریضاؤں کو بیٹی کی شکل و صورت دی ہے۔ کیوں؟"

ڈاکٹر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔" میں اس آخری سوال کا جواب دے رہا ہوں۔ اس کے بعد تم میرا پیچھا چھوڑ دینا۔" اس نے چشمہ اتارا اور اپنی پیشانی کو ہتھیلیوں سے ملنے لگا۔" میں ان عورتوں کے کیس لیتا ہوں جو قبول صورت بھی نہیں ہوتیں اور میری سرجری کے بعد وہ اپنی عمر سے بیس سال کم لگتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا احساس محرومی ختم ہو جاتا ہے اور وہ خود اعتمادی سے بھر جاتی ہیں۔" اس کی آواز بلند ہوگئی" تم پوچھتی ہو کہ میں نے اپنی بعض مریضاؤں کو اپنی بیٹی کا چہرہ کیوں دیا۔ میں اس کی وجہ بتاتا ہوں اس لیے کہ میری بیٹی بہت

خوبصورت تھی۔ ایسے حسن کی ہر عورت آرزو کرتی ہے۔'' ڈاکٹر اٹھ کر کھڑا ہوا'' اور اب ہماری گفتگو ختم۔''

اب سفینہ کچھ اور نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔ اس نے دیکھا' ڈاکٹر کا داہنا ہاتھ سختی سے اپنے پہلو پر جما ہوا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا' اسے اس ہاتھ میں واضح طور پر لرزش نظر آئی۔

دروازے پر پہنچ کر ڈاکٹر نے کہا'' مس انصار مختار کا نام سن کر ہی میری طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔ تم صالحہ کو فون کر کے اپنی بچی کے نئے معالج کا نام بتا دینا۔ تمہاری بچی کی فائل وہاں بھجوا دی جائے گی۔ میں اب کبھی تمہاری یا تمہاری بچی کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں' نہ ہی آواز سننا۔''

وہ اتنا قریب تھا کہ سفینہ غیر ارادی طور پر گھبرا کر دو رہٹ گئی۔ اس شخص نے بلاشبہ کوئی خوف زدہ کرنے والی بات کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی نفرت تھی' جو سفینہ کو اندر سے جلا رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر ڈاکٹر کے ہاتھ میں ریوالور ہوتا تو اس وقت وہ اس کے استعمال سے ذرا بھی نہ چوکتا۔

☆☆☆

طوبیٰ دروازہ لاک کر کے گھر سے باہر آئی تو اسے ڈارک کلر کی وہ چھوٹی کار سامنے نظر آئی۔ اس سڑک پر اجنبی کار کا نظر آنا' اور وہ بھی اتنے سویرے ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کار کو دیکھ کر طوبیٰ کو عجیب سا احساس ہوا۔

باہر اچھی خاصی خنکی تھی۔ اس نے کتابوں کو بائیں ہاتھ میں لیا اور داہنے ہاتھ سے اپنی جیکٹ کی زپ گردن تک کھینچ لی۔ وہ چند منٹ لیٹ تھی۔ آگے والے کارنر پر اسے اپنی سہیلیوں سے ملنا تھا۔ وہ بے چینی سے اس کی منتظر ہوں گی۔

سڑک سنسان تھی۔ پتوں سے محروم ٹنڈ منڈ درخت عجیب لگ رہے تھے۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ دستانے کیوں بھول آئی۔

کچھ آگے بڑھنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کار اس کے عین پیچھے تھی۔ اس نے کار کے ڈرائیور کے سائڈ والے دروازے کو آہستہ سے کھلتے دیکھا پھر ایک ہاتھ باہر آیا۔ اس میں کوئی چیز تھی۔ جس کا رخ اس کی طرف تھا۔ وہ گھبرا گئی

اور اس نے تیز بھاگنا شروع کر دیا۔ کار تیز آواز کے ساتھ اس کی طرف لپکی۔ ایسا لگتا تھا کہ کار اسے کچل ڈالے گی لیکن عین موقع پر کار نے یوٹرن لیا اور تیزی سے مخالف سمت میں نکل گئی۔

سسکیاں بھرتی ہوئی طوبیٰ نے سامنے والے گھر کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا اور دباتی ہی چلی گئی۔

☆☆☆

یونس نصیر نے فاطمہ سے ملاقات کی۔ ابتدا میں فاطمہ نے محتاط رویہ اختیار کیا لیکن جب اس نے بتایا کہ اسسٹنٹ پروسیکیوٹر سفینہ انصار کے ایما پر آیا ہے اور خانم مرڈر کیس میں اس کی شہادت پر بات کرنی ہے۔'' اس رات جو کار آپ نے مختار عظیم کے گھر کے سامنے دیکھی تھی' اس کے بارے میں پوچھنا ہے۔''

سفینہ کا نام سنتے ہی فاطمہ شروع ہو گئی'' میں ان کا تازہ کیس پڑھتی رہی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ سفینہ نے ایک مجرم کو کیفر کردار کو پہنچایا۔ اگر وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں تو مجھے خوشی ہو گی۔''

'' فی الحال تو میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔'' یونس نے کہا'' ہو سکتا ہے کہ بعد میں خود سفینہ آپ کے پاس آئیں۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ چہرے کے تاثرات سے یونس کو اندازہ ہو گیا کہ فاطمہ کو اپنا پچھلا تجربہ یاد آ رہا ہے' جب پروسیکیوٹر نے عدالت میں اسے مضحکہ خیز ثابت کر کے رکھ دیا تھا۔ بالآخر فاطمہ نے کہا'' میں سمجھتی ہوں کہ میں صرف سفینہ انصار سے اس موضوع پر بات کر سکوں گی۔''

☆☆☆

سفینہ انصار خلاف معمول تاخیر سے کورٹ ہاؤس پہنچی۔ اس نے پہلے ہی فون کر دیا تھا کہ ایک ضروری کام سے وہ دس بجے تک دفتر پہنچ سکے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اظہر عباس کو اس کے ضروری کام کی نوعیت معلوم ہو گئی تو اسے دل کا دورہ بھی پڑ سکتا ہے۔

اس کے داخل ہوتے ہی ٹیلی فون آپریٹر نے کہا'' مس انصار اظہر صاحب

آپ کے منتظر ہیں۔"

سفینہ خدشوں میں گھر گئی لیکن وہ اظہر کے دفتر میں داخل ہوئی تو وہ غصے میں نہیں تھا اور اظہر نے تمہید میں وقت ضائع نہیں کیا۔

"سفینہ...... طوبیٰ اس وقت تمہارے سامنے والے گھر میں ہے اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ خیریت سے ہے۔"

سفینہ متوحش ہو گئی "بات کیا ہے؟"

"ہمیں یقینی طور پر معلوم نہیں۔ طوبیٰ نے بتایا کہ تم ساڑھے چھ بجے گھر سے نکل گئی تھیں۔" اظہر کی نگاہوں میں تجسس تھا۔

"جی ہاں' یہ درست ہے۔"

"طوبیٰ گھر سے نکلی تو وہاں ایک اجنبی کار موجود تھی۔ وہ کار کے پاس سے گزری تو کار کا دروازہ کھلا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ طوبیٰ یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ کیا چیز تھی اور وہ ڈرائیور کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکی پھر کار اسٹارٹ ہوئی اور طوبیٰ پر جھپٹی مگر آخر میں یوٹرن لے کر چلی گئی۔ طوبیٰ ڈر کر سامنے والوں کے ہاں چلی گئی۔"

سفینہ پریشان ہو گئی "اور وہ اس وقت وہیں ہے؟"

"ہاں تم چاہو تو فون پر اس سے بات کر لو۔ چاہو تو گھر چلی جاؤ۔ ویسے یہ بتاؤ' تمہاری بچی تخیلاتی ذہن کی تو نہیں ہے۔ یا پھر ممکن ہے کوئی اسے......اور اس کے ذریعے تمہیں خوف زدہ کرنا چاہ رہا ہو۔"

"کوئی طوبیٰ کو یا مجھے کیوں خوف زدہ کرنے لگا؟"

"اس کام میں ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ ابھی تم نے ایک کیس نمٹایا ہے۔ تمہیں میڈیا کی توجہ حاصل ہوئی ہے۔ جسے تم نے سزا دلوائی ہے' یہ اس کے دوستوں کی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔"

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا اور جہاں تک طوبیٰ کا تعلق ہے وہ خیالوں میں گم رہنے والی لڑکی نہیں۔" سفینہ نے کہا۔

"تم اس سے بات تو کر لو۔" اظہر نے فون کی طرف اشارہ کیا۔

پڑوس کے گھر میں فون طوبیٰ نے ریسیو کیا "مجھے معلوم تھا یہ آپ کا فون ہو گا۔ ممی' اب میں ٹھیک ہوں اور اسکول جانا چاہتی ہوں۔ آنٹی کہہ رہی ہیں کہ وہ مجھے اسکول پہنچا دیں گی اور ممی مجھے آج سہ پہر ڈرامے کی ریہرسل میں بھی تو جانا ہے۔"

سفینہ تیزی سے سوچ رہی تھی کہ طوبیٰ کے لیے اسکول جانے میں بہتری تھی۔ پڑوس کے گھر بیٹھ کر وہ اس واقعے کے بارے میں سوچتی رہے گی۔ "ٹھیک ہے تم اسکول جاؤ۔" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا "لیکن میں تمہیں اسکول سے پک کروں گی۔ تم اکیلے گھر مت جانا۔"

ریسیور رکھ کر وہ اظہر کی طرف مڑی "میں جلدی گھر چلی جاؤں گی' کوئی حرج تو نہیں؟"

اظہر خوش دلی سے مسکرایا "تم ضرور جاؤ اور بچی سے بہت احتیاط سے پوچھ گچھ کرنا۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ معاملہ سنگین تو نہیں ہے۔"

سفینہ اپنے کمرے میں گئی۔ ذرا دیر بعد یونس آیا اور اسے فاطمہ کے متعلق بتایا "وہ صرف تم سے بات کرے گی۔" اس نے کہا۔

"اچھا میں فون پر اس سے بات کر لوں۔"

اس نے فاطمہ سے فون پر...... "ہیلو فاطمہ بیگم' میں سفینہ انصار بول رہی ہوں......" کہا تھا۔ اس کے جواب میں اسے دس منٹ تک سننا پڑا۔ یونس اسے استعجابیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا بالآخر اس نے ریسیور رکھ دیا "یونس' فاطمہ اس سلوک سے بہت ناخوش ہے جو ہمارے محکمے نے دس سال پہلے اس کے ساتھ کیا تھا۔" اس نے کہا "اس شکایت کے بعد اس نے بتایا کہ اس کی بیٹی اور داماد اس بات کے مخالف ہیں کہ وہ اس کے بارے میں کوئی بات کرے۔ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں اور کل واپس آ رہے ہیں۔ اگر مجھے اس سے ملنا ہے تو آج شام پانچ بجے مل سکتی ہوں۔ بیٹی اور داماد کی واپسی کے بعد یہ ممکن نہیں ہو گا۔" وہ کہتے کہتے رکی اور پھر بولی "اور یہ آسان نہیں ہے میرے لیے۔" اس نے یونس کو طوبیٰ کے صبح والے واقعے کے متعلق بتایا۔

یونس اٹھ کر کھڑا ہوا۔ "میں تمہارے گھر جاؤں گا۔ جس دوران تم فاطمہ سے

ملو گی میں طوبیٰ کو آئس کریم کھلانے لے جاؤں گا۔ اس دوران میں' میں اس سے اس واقعے کے متعلق بھی پوچھ لوں گا۔'' اس نے کہا۔

سفینہ کے چہرے پر ہچکچاہٹ دیکھ کر اس نے مزید کہا ''تم بلاشبہ ذہین ہو سفینہ لیکن اس معاملے میں تم سے اچھی تفتیش کار ثابت نہیں ہو سکتیں۔ یہ کام میرا ہے' مجھے کرنے دو۔''

سفینہ اسے غور سے دیکھتی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یونس اپنے کام کا ماہر تھا۔ ''ٹھیک ہے یونس۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

☆☆☆

منگل کی شام ارشد جمال نے شام نگر کا رخ کیا' جہاں ایک پہاڑی پر بنے ہوئے مکان میں اس کا نوادرات کا خزانہ تھا۔ مرشد آباد سے نکل کر اسے خوشی ہوئی۔ وہ بہت تھک گیا تھا' ہفتے کو وہ سردھام گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک مکان پر ہاتھ صاف کیا۔ چند ماہ پہلے وہاں ہونے والی ایک پارٹی میں شریک ہوا تھا۔ اس موقع پر میزبان خاتون نے باتوں ہی باتوں میں بتایا تھا کہ 28 اکتوبر کو وہ اپنے بیٹے کی برات لے کر سعید آباد جائے گی اور یہ بات ارشد نے گرہ میں باندھ لی تھی۔ سو 28 اکتوبر کو وہ مکان خالی ملا تھا۔

ارشد کا شام نگر والا مکان بہت بڑا نہیں تھا مگر وہ خوبصورت بھی تھا اور مہنگے نوادرات سے آراستہ بھی۔ وہاں پہنچ کر وہ ذرا دیر میں تازہ دم ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنی کار سے سردھام سے چرائی ہوئی چیزیں نکالیں اور اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

لیکن اس روز وہ ہمیشہ کی طرح خوش نہیں تھا۔ نہ ہی وہ فتح مندی کے احساس سے سرشار تھا۔ اصل میں ایک مبہم سی فکر مندی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ وہ سردھام والی واردات کو ذہن میں دہرا رہا تھا۔

اس مکان کا صفایا کرنے کے بعد وہ اپنی گاڑی میں ہائی وے کے ٹریفک میں شامل ہوا تو اسے پولیس کی دو سائرن بجاتی گاڑیاں جاتی دکھائی دیں اور پھر اس نے ان گاڑیوں کو اس ذیلی سڑک پر مڑتے دیکھا' جہاں سے وہ آیا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا کہ پولیس کا رخ اس مکان کی طرف ہے' جس کا وہ صفایا

کر کے آرہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ واردات کے دوران میں اس کا ہاتھ کسی ایسے خاموش الارم سے چھو گیا تھا' جو ماسٹر الارم سسٹم سے منسلک نہیں تھا کیونکہ ماسٹر سسٹم کو تو اس نے ابتدا ہی میں ناکارہ کر دیا تھا۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے' اس مکان میں اور طرح کی سیکیورٹی بھی ہو۔ یہ جدید دور ہے۔ اب تو کیمرے چھپا کر نصب کرنا بھی بچوں کا کھیل بن گیا ہے۔ واردات کے دوران میں وہ ہمیشہ چہرے پر نقاب چڑھا لیتا تھا لیکن اس واردات میں ایک موقع پر اس نے کانسی کے ایک مجسمے کو دیکھنے کے لیے چہرے سے نقاب ہٹائی تھی۔ وہ اس کی حماقت ہی تھی کیونکہ وہ مجسمہ بہت عام سی چیز تھا۔

لیکن یہ بہت موہوم خدشہ تھا کہ اس وقت وہ کسی کیمرے کے فوکس میں آ گیا ہو۔ لہٰذا اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ صفائی کرنے والی عورت میری بہت مستعد تھی۔ وہ ایمان دار بھی تھی اور صفائی بھی بہت اچھی طرح کرتی تھی۔ وہ یہاں موجود چیزوں کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھ سکتی تھی لیکن اس کے ہاتھ سے کبھی نقصان بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دس سال سے ہر روز صفائی کرنے کے لیے یہاں آ رہی تھی۔

ارشد نے پریشانی کو ذہن سے جھٹکا۔ اب اسے اس خوشی کا احساس ہوا' جو اسے یہاں آنے پر ہمیشہ ہوتی تھی۔ اتنے سارے قیمتی نوادرات! اب ان نئی چیزوں کو رکھنا تھا۔

وہ ماسٹر بیڈ روم میں داخل ہوا۔ وہ تازہ ترین واردات سے حاصل ہونے والے تصویری فریم کا موازنہ اس فریم سے کرنا چاہتا تھا جو پچھلے گیارہ برس سے اس کی نائٹ ٹیبل کی زینت تھا۔

موازنہ کرتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ یہ دوسرا فریم جعلی ہے۔ قیمتی چیزوں کے معاملے میں وہ کم ہی بے وقوف بنتا تھا لیکن اس بار وہ بے وقوف بنا تھا۔ وہ پرانے فریم کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس فریم میں سے نازنین کا چہرہ اسے جھانک رہا تھا۔

وہ تقریباً گیارہ سال پہلے کی اس رات کو یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ڈرائنگ

روم کی کھلی کھڑکی سے گھر میں داخل ہوا تھا اور وہاں سے ماسٹر بیڈ روم میں گیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اس وقت مکان خالی تھا۔

ارشد کے پاس مختار کے گھر کا سیکیورٹی کوڈ موجود تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو وہ کھلی ہوئی کھڑکی نظر آ گئی۔ وہ بیڈ روم میں پہنچا تو اس کی نظر نائٹ ٹیبل پر رکھے ہوئے فریم پر پڑی۔ وہ اس کا معائنہ کر رہا تھا کہ اسے آواز سنائی دی۔ نازنین کی آواز۔ وہ بوکھلا گیا۔ اس نے جلدی سے فریم کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور الماری میں چھپ گیا۔

اس وقت فریم کو دیکھتے ہوئے ارشد نے سوچا کہ آخر اس کی بھی کوئی وجہ ہو گی کہ اس نے اب تک اس فریم سے نازنین کی تصویر نہیں نکالی ہے پھر اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ یہ تصویر نہ ہوتی تو اس کے ذہن سے نازنین کے چہرے کے مسخ شدہ نقوش کی یاد کبھی نہ مٹتی۔ وہ نازنین کا وہ چہرہ کبھی نہ بھولتا جو اس رات اس نے مختار کے گھر سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

سفینہ آفس سے نکل رہی تھی کہ جعفر کا فون آ گیا۔ ''میں آج ڈاکٹر سلمان سے ملی تھی۔'' سفینہ جلدی جلدی اسے بتانے لگی ''اور ابھی تھوڑی دیر بعد مجھے فاطمہ سے ملنا ہے۔ اس وقت میں زیادہ بات نہیں کر سکتی۔ مجھے طوبیٰ کو اسکول سے پک کرنا ہے۔''

''میں ڈاکٹر سے ملاقات کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں اور جو کچھ فاطمہ سے معلوم ہو گا وہ بھی۔ کیوں نہ رات کے کھانے پر ملیں۔''

''آج گھر پر ہی رہنا چاہتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو......'' ''کیوں نہیں میں گھر آ جاؤں گا۔ ساڑھے سات بجے ٹھیک رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

سفینہ نے طوبیٰ کو اسکول سے پک کیا۔ اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ طوبیٰ کے ذہن پر صبح کا واقعہ نہیں بلکہ ڈرامے کی ریہرسل چھائی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس نے اس موضوع کو نہیں چھیڑا۔

وہ گھر پہنچی ہی تھی کہ یونس نصیر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت پھولا ہوا

بریف کیس تھا۔ اس نے طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے تھپتھپایا ''اس میں فاطمہ کا اصل بیان موجود ہے۔'' اس نے کہا ''ہم تازہ بیان کا اس سے موازنہ کریں گے۔'' پھر وہ طوبیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا ''تم کیسی ہو گڑیا؟''

''جی ٹھیک ہوں۔ آج مجھے ڈرامے کی ریہرسل میں جانا ہے۔''

فاطمہ سے ملنے کے لیے جاتے ہوئے سفینہ خاصی اعصاب زدہ ہو رہی تھی۔ بالآخر اس نے طوبیٰ کو صبح والے واقعے پر گفتگو کے لیے آمادہ کر ہی لیا لیکن طوبیٰ اس واقعے کو غیر اہم سمجھ رہی تھی بلکہ وہ اسے اہمیت دینے کو تیار ہی نہیں تھی۔ سب کچھ سننے کے بعد سفینہ بھی یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ اس کار میں کوئی ایسا شخص ہو گا جو طوبیٰ سے کسی کا پتہ پوچھنا چاہتا ہو گا۔ کوئی ایسا شخص جو غلط بلاک میں چلا گیا ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ طوبیٰ نے اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر نہیں' گھٹا کر بیان کیا ہے۔

☆☆☆

سفینہ کے گاڑی پارک کرتے ہی دروازہ کھل گیا۔

فاطمہ سفید بالوں والی دبلی پتلی عورت تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی نرمی تھی۔ سفینہ کے پہنچتے ہی اس نے باتیں شروع کر دیں۔ ''بالکل اخبار میں چھپی تصویر کی طرح۔'' وہ بولی' ''میرا بڑا جی چاہتا تھا کہ عدالت جاؤں اور اس مقدمے کی کاروائی دیکھوں۔''

سفینہ کو وہ بہت اچھی لگی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس کی بے ساختہ گفتگو سنتی رہے لیکن وقت کم تھا ''آنٹی میں نازنین کے قتل والی رات کے متعلق آپ سے کچھ سننا چاہتی ہوں۔''

پندرہ منٹ تک سننے کے بعد سفینہ کو ایک ہی بات معلوم ہوئی ورنہ زیادہ تر گفتگو اس بچے احمر اور اس کے مسائل کے متعلق ہوتی رہی۔

''تو آپ نے مختار کے گھر کے سامنے وہ کار دیکھی تھی لیکن آپ کو اتنا یقین کیوں ہے کہ وہ کار اسی کے گھر آنے والے کسی شخص کی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مہمان کی ہو۔ جہاں آپ تھیں اس گھر میں بھی دعوت ہو رہی تھی۔'' سفینہ نے کہا۔

''کیونکہ مہمانوں کی صرف تین کاریں تھیں اور میں تینوں کو پہچانتی تھی اور

جب عدالت میں اس اظہر عباس نے مجھے تماشا بنا دیا تو میں نے بعد میں ان تینوں مہمانوں سے بات کی۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ان میں سے کوئی بھی پاپا کی کار میں وہاں نہیں آیا تھا۔''

''پاپا کی کار؟'' سفینہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں' احمر نے یہی کہا تھا۔ احمر کی سمجھ میں رنگ نہیں آتے تھے۔ آپ کسی کار کی طرف اشارہ کریں اور احمر سے اس کا رنگ پوچھیں تو وہ نہیں بتا سکتا لیکن کوئی جانا پہچانا رنگ یا کار نظر آ جائے تو وہ اس حوالے سے اسے پہچان سکتا تھا۔ اس رات اس نے اسے پاپا کی کار کہا تو اس لیے وہ سیاہ رنگ کی فاکسی تھی۔''

''آپ نے عدالت میں کہا کہ آپ نے کار کو دیکھا تھا؟''

''ہاں' میں ساڑھے سات بجے احمر کے گھر پہنچی تو وہ کار موجود نہیں تھی اور جب احمر نے اشارہ کرتے ہوئے اس کے بارے میں بتایا تو وہ جا رہی تھی۔ بس یہی ہے کہ اسے ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی۔ نمبر پلیٹ پر میں نے البتہ 3 اور M ضرور دیکھا تھا۔ میں نے مختار وکیل کو...... کیا نام تھا اس کا...... ہاں ظہیر۔ اسے میں نے یہ بات بتانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کہا کہ ذہنی طور پر کمزور بچے کی شہادت میری گواہی کو بھی غیر موثر کر دے گی۔ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں عدالت کو بتاتی کہ احمر اس کار کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا تھا۔''

☆☆☆

شاہ زیب کو شام کا وقت بہت اچھا لگتا تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ اپنے لیے جام بناتا اور بڑے سکون سے بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے سامنے بیٹھی اپنی بیوی تمکنت کو تکتا رہتا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا لیکن آج وہ اتنا پرسکون نہیں تھا۔

تمکنت کاؤچ پر نیم دراز تھی۔ اس نے اچانک کہا ''تم کچھ پریشان ہو شاہ زیب۔''

''ہاں' میں سفینہ کی طرف سے پریشان ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا ''میں نہیں سمجھتا کہ وہ مختار کیس کا پیچھا چھوڑے گی۔ کل میں نے گورنر سے بات کر کے جج

شپ کے امیدواروں کی فہرست رکوائی جسے منظوری کے لیے اسمبلی میں پیش کیا جانا تھا۔''

''میں فی الوقت سفینہ کا نام اسی طرح رکوا سکتا تھا۔ میں اور کیا کرتا۔ تم جانتی ہو کہ مبشر حسین کتنا اچھا میئر ہے۔ اس کے ساتھ مل کر میں نے اس شہر کے لیے کتنا کام کیا ہے۔ کتنی اصلاحات کی ہیں۔ اب وہ الیکشن نہیں لڑ سکتا لیکن چار سال بعد ہم اسے دوبارہ واپس لے آئیں گے۔ جب تک ہمیں اظہر عباس سے کام لینا ہوگا تاکہ اب تک کا کیا کرایا ضائع نہ ہو جائے۔ اگر اظہر الیکشن نہیں لڑے گا تو دوسری پارٹی آ جائے گی اور ہمارا اب تک کا کام ضائع ہو جائے گا۔''

تمکنت نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بہت تھکا ہوا اور ہمیشہ کے برعکس بوڑھا لگ رہا تھا' ایسا کرتے ہیں کہ اتوار کو سفینہ اور طوبیٰ کو مدعو کر لیتے ہیں۔ اس نے تجویز پیش کی۔ ''تم اسے سمجھانے کی کوشش کرنا۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ مختار اس قابل ہے کہ اس کے لیے اتنے لوگوں کا مستقبل اور شہر کا مستقبل داؤ پر لگایا جائے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں آج اسے فون کروں گا۔'' شاہ زیب نے گہری سانس لے کر کہا۔

جعفر سعید نے ٹھیک ساڑھے سات بجے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دروازہ اس بار بھی طوبیٰ نے کھولا۔ وہ اس وقت قدیم شہزادیوں والا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ''میں کسی غلط گھر میں تو نہیں آ گیا؟'' جعفر نے کہا ''یہاں کوئی شہزادی تو نہیں رہتی تھی۔ وہ تو بڑی پیاری سی لیکن عام سی لڑکی تھی۔''

''میں وہی ہوں انکل۔ اصل میں' میں ایک ڈرامے میں حصہ لے رہی ہوں۔''

''مجھے یقین ہے' تمہیں پہلا انعام ملے گا۔'' جعفر نے کہا۔ اندر گھس کر اس نے نتھنے پھیلائے اور گہری گہری سانسیں لیں ''آہ...... بڑی اچھی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔''

''مما کچن میں ہیں' کچھ پکا رہی ہیں۔''

اس وقت سفینہ کچن سے نکل آئی۔ وہ تولیے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے

آئی تھی۔ گھر کی سادہ قمیص شلوار میں وہ بہت پیاری اور کم عمر لگ رہی تھی جیسے کوئی گھریلو عورت ہو۔ سفینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن اس کی آنکھوں سے جھلکتی فکر مندی نہیں چھپ سکی تھی ’’تم اندر بیٹھو آرام سے۔‘‘ اس نے جعفر سے کہا ’’میں ذرا طوبیٰ کو کمیونٹی سینٹر چھوڑ آؤں۔‘‘

’’تو یہ کام میں ہی کیوں نہ کرلوں۔‘‘ جعفر نے تجویز پیش کی۔

’’چلو ایسا کرلو لیکن اسے ہال میں پہنچا کر آنا۔‘‘

’’ممی میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔‘‘ طوبیٰ کے لہجے میں احتجاج تھا۔

’’تمہیں نہیں مجھے تو ہے۔‘‘ سفینہ نے کہا۔

جعفر کو فکر ہوئی کہ یہ کس طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس نے کہا ’’سفینہ۔ میں اپنی بہن کو اسکول لے جاتا رہا ہوں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اس کے معاملے میں غیر ذمے داری کی ہو۔ میں طوبیٰ کو ہال کے اندر چھوڑ کر آؤں گا۔ چلو طوبیٰ شہزادی۔‘‘

جعفر طوبیٰ کو لے کر نکل آیا۔ راستے میں طوبیٰ نے اسے پورا واقعہ سنایا ’’ممی اوپر سے بڑی بہادر بنتی ہیں لیکن مجھے معلوم ہے وہ بہت ڈر گئی ہیں۔‘‘ اس نے کہا ’’وہ ویسے بھی میری بہت فکر کرتی ہیں۔ کاش میں نے انہیں یہ سب بتایا ہی نہ ہوتا۔‘‘

جعفر چلتے چلتے رک گیا اور اس نے طوبیٰ کو بہت غور سے دیکھا۔ ’’میری بات سنو گڑیا۔‘‘ اس نے کہا ’’ایسی کوئی بات ہو تو ممی سے کبھی نہیں چھپاتے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ یہ غلطی کبھی نہیں کرو گی۔‘‘

’’کبھی نہیں کروں گی انکل۔ یہ وعدہ تو میں ممی سے بھی کر چکی ہوں۔‘‘ طوبیٰ کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ ابھری ’’میں وعدہ کرتی ہوں تو پورا بھی کرتی ہوں۔ سوائے صبح سو کر اٹھنے کے۔ مجھے سو کر اٹھنا اچھا نہیں لگتا۔‘‘

’’وہ تو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ نیند ہوتی ہی اتنی پیاری ہے۔‘‘

☆☆☆

پانچ منٹ بعد جعفر کچن کے دروازے کے باہر کرسی پر بیٹھا تھا۔ سفینہ سلاد بنا رہی تھی۔ جعفر نے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ’’طوبیٰ نے مجھے آج کے واقعے

کے متعلق بتایا ہے۔‘‘ اس نے کہا ’’مجھے بتاؤ کوئی پریشانی کی بات ہے؟‘‘

’’ہمارے ایک تفتیش کار یونس نصیر نے طوبیٰ سے بات کی تھی اور وہ فکر مند ہے۔ طوبیٰ نے دروازہ کھلتے دیکھا۔ ایک ہاتھ باہر آیا۔ اس میں کوئی چیز تھی جس کا رخ طوبیٰ کی طرف تھا۔ یونس کا خیال ہے کہ کار والے نے کیمرے سے طوبیٰ کی تصویر کھینچی تھی۔‘‘

جعفر کو اس کی آواز میں لرزش محسوس ہوئی ’’لیکن کیوں؟‘‘

’’یہ مجھے نہیں معلوم۔ اظہر عباس کے خیال میں اس کا تعلق میرے اس کیس سے ہے جس کا فیصلہ ابھی حال میں سنایا گیا ہے لیکن میں اس سے متفق نہیں۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ میں طوبیٰ کے تحفظ کے لیے کیا کروں۔‘‘

’’اکیلے یہ فکر کرنا بہت دشوار کام ہے۔‘‘

’’یہ بات تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ میرے گھر میں کوئی مرد نہیں؟‘‘ سفینہ نے تیز لہجے میں کہا ’’مگر طوبیٰ کے چہرے کے نشان دیکھو۔ یہ اس وقت ہوا جب وہ اپنے باپ کے ساتھ تھی۔ نہیں جعفر صاحب میں اور طوبیٰ ایک دوسرے کے لیے بہت کافی ہیں۔‘‘

اچانک اس کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا ’’سوری جعفر میری بات کا برا نہ ماننا۔ ایسے ہی کبھی کبھی تلخ ہو جاتی ہوں مگر خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل اہمیت تو میری ڈاکٹر سلمان اور فاطمہ سے ملاقات کی ہے۔‘‘

سفینہ نے کھانا لگایا۔ کھانے کے دوران میں وہ جعفر کو ڈاکٹر سلمان سے ملاقات کے بارے میں بتاتی رہی۔ ’’یہ طے ہے کہ وہ مختار سے نفرت کرتا ہے اور یہ مختلف نوعیت کی نفرت ہے۔‘‘ اس نے کہا ’’میرا مطلب ہے کہ مقتول کے لواحقین قاتل سے نفرت کرتے ہیں اور انہیں سزا ملتے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے غصے میں دکھ بھی گھلا ملا ہوتا ہے۔ میں نے ایسے ماں باپ دیکھے ہیں جو اپنے مقتول بچوں کے بچپن کے بارے میں بتاتے بتاتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ میں نے ایسے باپ دیکھے ہیں جو کہتے ہیں کہ میں قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ لیکن ڈاکٹر سلمان کو

میں نے مختلف پایا۔ اس کے پاس مختار عظیم کے لیے صرف نفرت ہے۔ خالص نفرت!''

''اس سے تم نے کیا نتیجہ نکالا؟''

''میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے لیے ڈاکٹر سلمان اور نازنین کے تعلق کو سمجھنا اور ضروری ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر کی اپنی گواہی کے مطابق نازنین کا بچپن اس سے دور گزرا۔ وہ اٹھارہ سال کی تھی' جب اس کے پاس آئی۔ نازنین کی تصویروں سے پتا چلتا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر حسین تھی۔'' سفینہ اٹھی اور برتن سمیٹنے لگی ''تم اس پر غور کرو۔ میں برتن رکھ آؤں پھر میں تمہیں فاطمہ کے بارے میں بتاؤں گی۔''

وہ واپس آئی تو گفتگو کا سلسلہ جڑا۔ سفینہ' جعفر کو فاطمہ کے متعلق بتانے لگی۔

''مجھے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تنہا احمر خاصا معتبر اور موثر گواہ تھا۔'' اس نے آخر میں کہا۔

''فاطمہ سے خود ظہیر صاحب نے بات کی تھی۔'' جعفر نے یاد کرتے ہوئے کہا ''مجھے اس بچے کا حوالہ یاد ہے لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔''

''آج یونس نے مجھے اس کیس کی فائل دی ہے۔ میں ان مردوں کے متعلق دیکھوں گی جن سے نازنین کے تعلقات رہے تھے۔ یہ تکا ہے' لگ بھی سکتا ہے۔ دوسرے اس سیاہ فاکسی کے متعلق چھان بین کرنی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان میں سے کسی کے پاس گیارہ سال پہلے سیاہ فاکسی تو نہیں تھی۔'' اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔

جعفر نے سمجھ لیا کہ وہ طوبیٰ کی واپسی کے متعلق سوچ رہی ہے۔ ''طوبیٰ کو واپس کب بلانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نو بجے' کافی پیو گے۔''

''ضرور اور کافی کے دوران میں تمہیں مختار اور بتول کے تعلقات کے بارے میں بتاؤں گا۔''

کافی پی گئی۔ جعفر کی بات سننے کے بعد سفینہ نے کہا ''میں سمجھ سکتی ہوں کہ ظہیر فاروقی بتول کو گواہ کے طو پر سامنے لانے سے کیوں ہچکچائے تھے لیکن اگر

نازنین کے قتل کے وقت مختار' بتول کے لیے محبت بھرے جذبات رکھتا تھا تو یہ حقیقت ڈاکٹر سلمان کی گواہی کو کسی حد تک غیر موثر ضرور کر سکتی ہے۔''

''بالکل درست۔ اس صورت میں نازنین کو کسی اور کے بھیجے ہوئے پھول گلدان میں رکھتے دیکھ کر مختار کا ردعمل یہی ہو سکتا ہے کہ جان چھوٹی۔''

فون کی گھنٹی بجی۔ جعفر نے گھڑی میں وقت دیکھا اور اٹھتے ہوئے کہا ''تم فون پر بات کرو۔ میں اتنی دیر میں طوبیٰ کو لے کر آتا ہوں۔''

''شکریہ جعفر۔'' سفینہ نے کہا اور ریسیور اٹھایا پھر وہ سنتی رہی۔ اس کے بعد گرم جوشی سے بولی ''انکل' میں خود آپ کو فون کرنے والی تھی۔''

جعفر باہر چلا گیا۔ واپسی میں وہ طوبیٰ کی شکایتیں سنتا رہا۔ وہ اتنی اچھی اداکاری کر رہی ہے لیکن اس کا رول چھوٹا کر دیا گیا ہے۔ اس پر جعفر نے تبصرہ کیا ''بڑے اداکاروں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

سفینہ نے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی جعفر کو اندازہ ہوگیا کہ ضرور کوئی سنگین بات ہوئی ہے۔ طوبیٰ کی پرجوش باتوں پر وہ بہ مشکل مسکرا رہی تھی۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے طوبیٰ۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے؟''

''جی ہاں' بس میں سونے جا رہی ہوں۔'' طوبیٰ نے جلدی سے کہا ''اچھا ممی' انکل......شب بخیر۔'' اس نے سفینہ کے رخسار پر بوسہ دیا اور اندر چلی گئی۔

جعفر نے دیکھا' سفینہ کے ہونٹ لرز رہے تھے ''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟'' اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

سفینہ نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی ''آج گورنر صاحب کو جج شپ کے لیے تین امیدواروں کے نام اسمبلی میں پیش کرنے تھے۔ ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ شاہ زیب انکل نے کہہ کر فی الحال وہ نام رکوا دیے ہیں۔''

''یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ شاہ زیب تمہیں بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔'' جعفر نے کہا پھر اچانک وہ اسے بغور دیکھنے لگا ''کہیں اس بات کا تعلق مختار عظیم کے کیس سے تو نہیں؟''

سفینہ نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کا چہرہ

سب کچھ بتا رہا تھا۔

"یہ تو بہت افسوس ناک ہے۔" مختار نے کہا "لیکن تم نے کہا کہ نام رکوائے گئے ہیں۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاہ زیب انکل میری خاطر زیادہ دیر تک اس معاملے کو ٹالے رکھیں گے۔ میں نے انہیں اپنی ڈاکٹر سلمان اور فاطمہ سے ملاقات کے بارے میں بتایا لیکن وہ متاثر نہیں ہوئے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کیس کو چھیڑ کر ایک طرف تو میں اظہر عباس کی اہلیت کو مشکوک بنا رہی ہوں اور دوسری طرف ٹیکس ادا کرنے والوں کے خون پسینے کی کمائی ایک ایسے کیس پر خرچ کر رہی ہوں' جس کا فیصلہ دس سال پہلے ہو چکا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پانچ اپیلوں کا مسترد ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ مختار مجرم ہے۔" سفینہ نے سر جھٹکا۔ "مجھے افسوس ہے جعفر کہ میں نے تمہارا وقت ضائع کیا مگر اب میں سمجھتی ہوں کہ شاہ زیب انکل کا موقف درست ہے۔ قاتل جیل میں ہے اور اپیل کی سماعت کرنے والی پانچ عدالتیں اس کی اپیل مسترد کر چکی ہیں۔ مجھے ان پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں اس معاملے سے ہاتھ اٹھا رہی ہوں۔"

جعفر کا چہرہ برہمی چھپانے کی کوشش میں کھنچ سا گیا۔ "بہت خوب تو میں اجازت چاہوں گا یور آنر۔" اس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "کھانا کھلانے کا شکریہ۔"

☆☆☆

بدھ۔ یکم نومبر۔

پولیس ہیڈکوارٹرز میں محکمہ سراغ رسانی کے چار افراد کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے اسکرین پر اس چور کے چہرے کا ایک رخ دیکھ رہے تھے۔ جس نے سرد حام کے ایک مکان میں واردات کی تھی۔ وہ تصویر بہت دھندلی تھی لیکن الیکٹرونک آلات کی مدد سے اسے بڑی حد تک صاف کرلیا گیا تھا۔ اب اس کے چہرے کے چند نقوش بالکل واضح تھے البتہ اس کی ناک اور ہونٹ بناوٹ کے اعتبار سے صاف اور واضح نہیں تھے۔ انسپکٹر محسن نے سوچا کہ اس کے باوجود یہ تصویر کسی نہ کسی کی یادداشت کو متحرک کرسکتی ہے۔

"اس کے پرنٹ نکالو اور ہر اس گھر میں بھجوا دو' جہاں چوری کی واردات ہو چکی ہے۔" اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا "تصویر بالکل صاف نہیں ہے لیکن بہر حال یہ پہلا سراغ ہے۔ ایک بار پہلے اس نے رکن قومی اسمبلی قمر جاوید کے گھر میں انگوٹھے کا ایک نشان چھوڑا تھا۔"

وہ کیس پولیس پر اب تک دباؤ کا سبب بنا ہوا تھا۔ اس واردات کے دوران میں قمر جاوید کی والدہ کا قتل ہوگیا تھا۔ صرف اسی لیے کہ عین وقت پر انہوں نے اس دعوت میں شرکت کا ارادہ ترک کر دیا تھا' جس میں گھر کے تمام افراد شامل ہونے جارہے تھے۔

☆☆☆

جام پور میں جبار احمد صبح چائے پیتے ہوئے اخبار پڑھ رہا تھا۔ دو سال پہلے وہ ریٹائر ہوا تھا۔ اب اپنی تیسری بیوی کے ساتھ اسے آٹھ سال ہو چکے تھے اور وہ بہت مطمئن تھا۔ بہت بار اسے پتا چلا کہ طمانیت کیا ہوتی ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اس سے پہلے والی شادیوں میں کیا کمی تھی۔ خیر ...... دیر آید درست آید۔

فون کی گھنٹی بجی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ فون کال پرانی ناخوش گوار یادوں کو جگانے والی ہے۔ ''ہیلو جبار احمد اسپیکنگ۔''

''جبار صاحب، میں مرشد آباد سے بول رہا ہوں یونس نصیر۔ میرا تعلق پروسیکیوٹر آفس سے ہے۔ نازنین مختار آپ کی سوتیلی بیٹی تھی نا۔''

''نازنین مختار یہ نام مجھے یاد نہیں۔ ایک منٹ، آپ نازو کی بات تو نہیں کر رہے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے، آپ اسے نازو کے نام سے پکارتے ہوں۔''

دوسری طرف سے کہا گیا۔

''ہاں، نازو میری دوسری بیوی کی بیٹی تھی۔ اس کے پہلے شوہر سے۔'' جبار کو احساس ہوا کہ فون کرنے والے نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ کیا نازو کو کچھ ہو گیا ہے؟''

''آپ کو نہیں معلوم کہ اسے گیارہ برس پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔''

''خدا کی پناہ۔ نہیں، مجھے تو علم نہیں۔'' جبار کی آواز ڈوبنے لگی ''میں تو ہر سال اس کے باپ کے پتے پر اسے عید کارڈ بھیجتا رہا ہوں لیکن اس کا جواب کبھی نہیں ملا۔''

''آپ نے آخری بار اسے دیکھا کب تھا؟''

''اٹھارہ سال پہلے۔ اپنی ماں کی موت کے بعد وہ ڈاکٹر سلمان کے پاس چلی گئی تھی۔ نازو ایک مشکل اور پریشان کن لڑکی تھی۔ وہ کبھی خوش نہیں رہی۔ جب میں نے اپنی پہلی بیوی کی موت کے بعد اس کی ماں سے شادی کی تو پہلی شادی سے میری دو بیٹیاں تھیں۔ میں نے نازو کو کشادہ دلی سے قبول کیا۔ میں نے اور صابرہ نے مل کر تینوں لڑکیوں کی پرورش کی۔ صابرہ کی موت کے بعد نازو اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ میں نے ایک بار ڈاکٹر سلمان کو فون کیا لیکن ڈاکٹر کا رویہ بہت خراب تھا۔ تم مجھے بتاؤ کہ نازو کا کیا ہوا؟''

''دس سال پہلے اس کے شوہر کو رقابت کے زیر اثر اسے قتل کرنے کے جرم میں سزا سنائی گئی تھی۔''

جبار احمد کے تصور میں نازو کا سراپا لہرا گیا۔ وہ دبلی پتلی بے رنگ لڑکی تھی جس کا منہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ وہ اپنی سوتیلی بہنوں سے ان کی خوب صورتی پر انہیں ملنے والی توجہ اور محبتوں پر چڑتی تھی۔ ''رقابت سے مراد یہ ہے کہ اس کا شوہر سمجھتا تھا کہ اس کے کسی اور سے تعلقات ہیں؟'' اس نے دھیمی آواز سے پوچھا۔

''کسی سے نہیں، متعدد لوگوں سے۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔''

اس کے لہجے نے مرشد آباد میں یونس نصیر کو ہلا دیا۔ سفینہ کا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ نازنین کے پس منظر کی چھان بین رنگ لانے والی تھی۔ ''جبار صاحب، آپ ذرا اپنی سوتیلی بیٹی کی ظاہری شخصیت کو لفظوں میں بیان کریں گے۔''

''وہ ...... وہ ...... بس یوں سمجھ لو کہ وہ بہ مشکل قبول صورت کہی جا سکتی تھی۔''

''آپ کے پاس اس کی تصویریں ہیں؟''

''ہاں ہیں لیکن آپ دس سال بعد اس معاملے کو کیوں اٹھا رہے ہیں؟''

''ہمارے ایک اسسٹنٹ پروسیکیوٹر کو شبہ ہے کہ اس کیس میں کئی اہم باتیں نظر انداز کر دی گئی تھیں۔'' یونس نے کہا ''آپ نازنین کی چند تصویریں ہمیں بھجوا دیجیے۔''

''ضرور، میں فوراً بھجواؤں گا۔''

☆☆☆

بدھ کی صبح سفینہ اپنے دفتر میں داخل ہوئی ہی تھی کہ اس کی سیکرٹری نے کہا ''پہلے آپ اظہر صاحب سے مل لیجیے۔''

سفینہ اظہر کے کمرے میں چلی گئی۔ اظہر نے تمہید میں وقت ضائع نہیں کیا ''کیا بات ہے سفینہ؟ مجھے پتا چلا ہے کہ گورنر صاحب نے جج شپ کے لیے نامزدگیاں ملتوی کر دی ہیں اور وہ بھی صرف تمہاری وجہ سے' کیا گڑبڑ ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں کیا کرسکتی ہوں اس سلسلے میں؟''

سفینہ کہنا چاہتی تھی کہ اظہر کو گورنر سے کہہ دینا چاہیے کہ اسے کسی بھی کیس کے ری اوپن ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ کسی بے قصور کو سزا نہیں ملنی چاہیے لیکن یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کہا ''ایسی کوئی بات نہیں۔ نامزدگیاں بھی پیش ہو جائیں گی۔''

''تمہارا شاہ زیب صاحب سے کوئی اختلاف تو نہیں؟''

''وہ تو میرے قریب ترین لوگوں میں سے ہیں۔''

سفینہ باہر جانے کے لیے مڑی تو اظہر عباس نے کہا ''مجھے تشویش ہے اس لیے کہ مجھے ڈر ہے' میری اپنی نامزدگی میں کوئی رکاوٹ نہ آجائے۔''

اپنے کمرے میں پہنچ کر سفینہ نے اپنی توجہ اپنے نئے کیس پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک پٹرول پمپ کی ڈکیتی کا کیس تھا۔ ایک اٹینڈنٹ کو گولی لگی تھی اور وہ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھا۔ اگر وہ ختم ہوگیا تو یہ قتل کا کیس بھی ہو جائے گا۔

لیکن وہ تصور میں خود کو جج کے عہدے کے لیے حلف اٹھاتے دیکھ رہی تھی۔ طوبیٰ بھی وہاں موجود تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ شاہ زیب اکبر کی آواز اس کی سماعت میں گونجی۔ اس کے لہجے میں سختی اور تلخی تھی۔ ''سفینہ ...... اپیل کی پانچ عدالتوں کو اس کیس میں کوئی سقم نظر نہیں آیا۔ ان کے خیال میں مختار مجرم ہے اسی لیے اس کی اپیلیں مسترد کر دی گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا تکلیف ہے۔''

اسے احساس ہوا کہ شاہ زیب کی بات درست ہے۔ اس نے سوچا کہ آج انہیں فون کر کے بتا دے گی کہ وہ مختار عام کے معاملے سے دست بردار ہو رہی ہے۔

☆☆☆

صدیقہ بیگم کو بتول نے بتا دیا تھا کہ مختار بہت مایوس اور دل گرفتہ ہے اس لیے وہ اس سے ملاقات کے لیے جا رہی تھی۔ وہ دبلی پتلی اور بوڑھی عورت تھی۔ اس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ بیٹے کے المیے نے اسے گھلا کر رکھ دیا تھا۔ اب تو اس کی چال میں بھی لرزش تھی۔ مختار نے اپنے خوش حالی کے دنوں میں اسے جو کچھ دیا تھا' وہ اس نے سنبھال کر رکھا تھا مگر اب وہ سب تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اس کی ماں کے پاس جو کچھ بھی تھا' وہ اس نے بیٹے کے لیے نظر ثانی کی اپیلوں پر لگا دیا تھا۔

وہ شام سے ذرا پہلے جیل پہنچی۔ مختار کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ جس بات سے وہ ڈرتی تھی' وہ رونما ہو گئی ہے۔ یعنی مختار نے امید چھوڑ دی ہے۔ ''مختار' کیا بات ہے بیٹے؟'' اس نے پوچھا۔

''امی ...... جعفر نے کل مجھے فون کیا تھا۔ وہ خاتون پروسیکیوٹر جو مجھ سے ملنے آئی تھی' اس نے میرے کیس سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔''

''تم بتول سے کیوں خفا ہو؟''

''میں اس سے خفا نہیں ہوں امی لیکن اب اسے اپنی زندگی شروع کر دینی چاہیے۔ مجھ سے بندھے رہنے سے اسے فائدہ نہیں نقصان ہوگا۔''

''لیکن بیٹے' وہ تم سے محبت کرتی ہے۔''

''اب اسے کسی اور سے محبت کرنی چاہیے۔ آخر میں نے بھی تو اسے چھوڑ کر کسی سے محبت کی تھی۔''

''میرے بیٹے......'' صدیقہ بیگم سے بولا نہیں گیا۔ سینے میں درد کی ایک لہر اٹھی تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ اب بائی پاس آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس نے مختار کو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ کیسے بتاتی۔ اس کی پریشانیوں میں اضافہ کرتی! اس وقت بیٹے کی آنکھوں میں اندر کا عکس دیکھتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں میں آنے کے لیے مچلنے لگے لیکن اس نے ان آنسوؤں کو پی لیا ''دیکھو بیٹے'

ایسی باتیں کر کے مجھے تکلیف مت پہنچاؤ۔''

اس نے التجا کی۔

ملاقات کا وقت ختم ہوگیا۔ باہر نکلتے ہی وہ رو پڑی۔ سینے میں ہونے والا درد اسے قدم نہیں اٹھانے دے رہا تھا۔

☆☆☆

خنکی اچانک بہت بڑھ گئی تھی۔ بابرا ذیشان اپنے آفس سے گھر جا رہی تھی۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ گھر سے سویٹر لے کر کیوں نہیں نکلی۔ بہر حال گھر زیادہ دور نہیں تھا اور پیدل چلنا اسے اچھا بھی لگتا تھا۔ وہ اس خوب صورت سال کے بارے میں سوچ رہی تھی، جس نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔ پہلے تو اسے خالہ کا ترکہ ملا پھر ڈاکٹر سلمان نے اسے وہ روپ دے دیا، جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پہلے اسے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا اور اب اس کے لیے توجہ ہی توجہ تھی۔

گھر کے قریب پہنچ کر وہ نروس ہوگئی۔ اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ گزشتہ رات وہ اپنے کسی کلائنٹ کے ساتھ میٹرو ہوٹل میں تھی۔ وہاں وہ ایک پروڈکٹ کی تشہیر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ہوٹل سے نکلتے ہوئے اس کی نظر ڈاکٹر سلمان پر پڑی، جو ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے ایک بار ایک ریسٹورنٹ سے نکل کر ٹیکسی روکتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اپنی بلڈنگ کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے چوکی دار کے سلام کا جواب دیا اور پلٹ کر دیکھا۔ بلڈنگ کے سامنے ہی ٹریفک سگنل تھا۔ بتی ابھی سرخ ہوئی تھی۔ اس کو ڈاکٹر سلمان کی سیاہ فاکس ویگن سگنل پر رکتی نظر آئی۔ گاڑی میں ڈاکٹر سلمان موجود تھا۔ غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

بابرا اندر گئی۔ اس نے لفٹ بلانے کے لیے بٹن دبایا۔ لفٹ کے آنے تک وہ سوچتی رہی۔ یہ ڈاکٹر میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں اس سلسلے میں کیا کروں؟ کیا کرنا چاہیے مجھے؟

☆☆☆

نو بجے سفینہ بیڈ روم میں گئی۔ طوبیٰ بستر پر کہانی کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، ''بس اب لائٹ آف کرو اور سو جاؤ۔'' اس نے کہا۔

طوبیٰ نے کمبل اوڑھتے ہوئے کہا ''ممی...... مجھے جعفر انکل بہت اچھے لگتے ہیں۔''

سفینہ، جعفر کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت فیصلہ کن اور خراب انداز میں اس کے گھر سے رخصت ہوا تھا۔ میں اجازت چاہوں گا یور آنر۔ کھانا کھلانے کا بہت شکریہ۔ یہ اس کے الوداعی الفاظ تھے۔

اب وہ کب آئیں گے؟'' طوبیٰ نے پوچھا۔

سفینہ اس پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی'' مجھے نہیں معلوم۔ ان دنوں وہ ایک کیس پر کام کر رہے ہیں...... اور بہت مصروف ہیں۔''

طوبیٰ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا'' مجھے ڈیڈی سے ان کے متعلق بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' اس نے کہا۔

سفینہ اس پر چونکی'' کیا مطلب؟''

''میں نے ڈیڈی کو بتایا تھا کہ آج کل ایک وکیل انکل ایک کیس پر بات کرنے کے لیے ہمارے گھر آتے ہیں۔ ڈیڈی نے ان کا نام پوچھا تھا۔

''تم نے نام بتا دیا۔ اس میں کیا بری بات ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم لیکن ڈیڈی کا موڈ آف ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ میری بات سنتے ہی وہ بولے کہ بس اب گھر چلو۔''

''دیکھو گڑیا، تمہارے ڈیڈی بھی اس وقت ایک بہت مشکل کیس میں الجھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے وہ اس کے بارے میں سوچ رہے ہوں۔''

''کیا واقعی؟'' طوبیٰ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''میرا تو یہی خیال ہے۔'' سفینہ نے کہا اور لائٹ آف کر دی۔ سفینہ نیچے چلی گئی۔ وہ گھر کا کچھ حساب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی نظر مختار عظیم کیس کی فائل پر پڑ گئی، جو یونس نصیر نے اسے دی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس معاملے سے ہاتھ اٹھانے کا فیصلہ کر چکی ہے لیکن پھر اس نے

سوچا کہ فائل پر ایک نظر ڈال لینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے فائل لی اور اپنی پسندیدہ کرسی کی طرف بڑھ گئی۔

ریکارڈ سے پتا چلتا تھا کہ مختار نے رات بارہ بج کر بیس منٹ پر پولیس کو مطلع کیا تھا۔ وہ بار بار دہراتا گیا تھا...... میری بیوی مر چکی ہے۔ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اور جب پولیس اس کے گھر پہنچی تو وہ نازنین کی لاش کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا رو رہا تھا۔ قریب گلدان الٹا پڑا تھا گلاب کے پھول لاش پر بکھرے ہوئے تھے۔

اس قتل کے سلسلے میں ارشد جمال نامی ایک شخص سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔

سفینہ کو یاد تھا کہ مختار نے اس سے ارشد جمال کا تذکرہ کیا تھا۔ اپنے بیان میں ارشد جمال نے بتایا تھا کہ وہ نوادرات کے معاملے میں ایکسپرٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نوادرات کے شوقین امیر لوگوں اور خصوصاً عورتوں کی رہنمائی کرتا ہے اور ان سے مناسب کمیشن لیتا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے گھر دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ نازنین اکثر اس کے ہاں دعوتوں میں آتی تھی۔ کبھی وہ مختار کے ساتھ بھی آتی تھی لیکن زیادہ تر وہ اکیلی ہی ہوتی تھی۔ پولیس نے خاصی چھان بین کی تھی لیکن ارشد اور نازنین کے درمیان کوئی خصوصی تعلق سامنے نہیں آیا تھا۔

سفینہ نے آدھی فائل دیکھ لی مگر کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ سوری جعفر۔ وہ بڑبڑائی۔ اب اس کی آنکھیں نیند سے جل رہی تھیں۔ اس نے سوچا' باقی فائل وہ کل دیکھے گی لیکن فائل بند کرتے کرتے اس کی نظر اگلے صفحے پر پڑی۔ وہ کنٹری کلب کے ایک ملازم کا بیان تھا۔ نازنین اور مختار اس کلب کے ممبر تھے اس انٹرویو میں اسے ایک نام نظر آیا' جسے دیکھ کر اس کی نیند اڑ گئی۔

کلب کا وہ ملازم نازنین کے بارے میں معلومات کا خزانہ تھا۔ ''ہم سب نازنین بیگم کو سرو کرنا چاہتے تھے۔'' اس نے بتایا' ''وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بڑی ٹپ دیتی تھیں۔ ان کے کئی دوست تھے۔ اس وجہ سے دوسری شادی شدہ عورتیں ان سے چڑتی تھیں۔''

''تمہارے خیال میں کسی سے ان کے تعلقات بھی تھے؟''

''یہ میں نہیں جانتا۔ میں نے انہیں تنہائی میں کسی سے ملتے نہیں دیکھا۔''

لیکن مسلسل دباؤ کے نتیجے میں اس نے کہا کہ نازنین اور امتیاز حیدر کے درمیان کوئی چکر چل رہا تھا۔

امتیاز حیدر کے نام نے سفینہ کو چونکایا تھا۔ پولیس نے امتیاز سے پوچھ گچھ کی تو اس نے اس بات سے انکار کیا کہ کلب کے باہر وہ کبھی نازنین سے ملا ہے یا کہ اس کے اور نازنین کے درمیان کسی نوعیت کے تعلقات تھے۔ اس نے بتایا کہ ان دنوں اس کا ایک عورت سے رومانس چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ایک مستند گواہ بھی تھا۔

کلب کے ملازم نے بتایا تھا کہ امتیاز تمام عورتوں سے ایک ہی انداز میں ملتا تھا اور انہیں جانم جان من ہنی اور ایسے ہی ناموں سے پکارتا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ امتیاز' نازنین کو کس طرح پکارتا تھا اس نے کہا'' میں نے انہیں نازنین بیگم کو ہمیشہ جانم کہتے سنا ہے۔''

سفینہ نے فائل بند کر دی۔ امتیاز حیدر...... وقاص مرزا کا موکل۔ تو کیا اس لیے جعفر سعید کے متعلق سن کر وقاص کا موڈ خراب ہوا تھا؟ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ جعفر مختار کی رہائی کے لیے پچھلے دس برس سے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ وہ اس کی نظر ثانی کی اپیل دائر کرتا رہا ہے تو عین ممکن ہے کہ وقاص کو کیس ری اوپن ہونے کی صورت میں اس میں اپنے موکل امتیاز حیدر کے ملوث ہونے کا ڈر ہو۔

''میں نے انہیں نازنین بیگم کو ہمیشہ جانم کہتے سنا ہے......'' کلب کے ملازم کے الفاظ نے سفینہ کو ایک نامعلوم خلش میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆☆☆

جمعرات 2 نومبر۔

جمعرات کی صبح صالحہ وہاب پونے نو بجے مطب پہنچی۔ پہلے مریض کا اپائنٹ منٹ دس بجے کا تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر سلمان ابھی مطب نہیں پہنچا تھا۔

استقبالیہ کلرک کچھ فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ صالحہ کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''صالحہ! بابرا ذیشان کا فون آیا تھا۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتی تھی اور اس نے خاص طور پر کہا کہ ڈاکٹر کو اس کال کا پتا نہ چلے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ بہت اہم بات

ہے۔ بہتر ہے' تم اسے فون کرلو۔ وہ اپنے گھر پر ہی ہوگی۔''

صالحہ اکاؤنٹنٹ کے کمرے میں چلی گئی' جو خالی تھا۔ وہاں سے اس نے بابرا ذیشان کو فون کیا ''میں صالحہ بول رہی ہوں۔ خیریت تو ہے؟''

''بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سلمان مسلسل میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ اب تو مجھے خوف آنے لگا ہے۔ میں کیا کروں میں ڈاکٹر کی شکر گزار بھی ہوں لیکن......''

''ڈاکٹر نے کبھی آپ سے براہ راست بات کی؟'' صالحہ نے پوچھا۔

''نہیں۔ کبھی نہیں۔''

''اچھا' آپ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ لوگوں سے بات کروں گی لیکن آپ اس بات کا کسی سے تذکرہ نہ کریں۔ دیکھیں ڈاکٹر سلمان کی بہت اچھی ساکھ ہے۔ اسے خراب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

''مجھ پر ڈاکٹر نے ایسا احسان کیا ہے کہ میں اس کا صلہ بھی نہیں دے سکتی۔'' بابرا نے کہا ''لیکن تمہیں اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا ہوگا۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔''

☆☆☆

جمعرات کی شام چار بجے یونس نصیر کو جام پور سے کوریر سروس۔ کے ذریعے بھیجا جانے والا پیکٹ ملا۔ اس نے فوراً لفافہ چاک کیا۔ لفافے میں چند تصویریں تھیں۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا رقعہ بھی تھا۔ لکھا تھا......

''یونس جاوید صاحب' نازو کی موت کا صحیح معنوں میں مجھے اس وقت احساس ہوا جب میں یہ تصویریں بھیجنے کے لیے لفافے میں رکھ رہا تھا۔ نازو بہت دشوار لڑکی تھی۔ میرا خیال ہے' یہ تصویریں آپ کو بہت کچھ بتا دیں گی۔ میری بیٹیاں بہت خوب صورت تھیں۔ جبکہ نازو بے چاری قبول صورت بھی نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں' نازو الگ کمپلیکس میں مبتلا ہوئی اور اس کی ماں' میری بیوی بھی اس بات پر کڑھتی تھی کہ نازو سے کوئی دوستی نہیں کرتا۔ اس کے نتیجے میں ہمارے گھر میں گروہ بندی تک ہوگئی۔ مجھے بہر حال امید تھی کہ ذرا پختگی آئے گی تو نازو نارمل ہو جائے گی۔ بہر حال شاید یہ تصویریں آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔ خیر اندیش' جبار احمد!''

بیس منٹ بعد یونس' سفینہ کے کمرے میں گیا اور وہ تصویریں سفینہ کے سامنے رکھ دیں' ''یہ نازنین کی تصویریں ہیں۔ بچ بچ کی نازنین بننے سے پہلے کی۔'' اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

☆☆☆

پانچ بجے سفینہ نے ڈاکٹر کے مطب فون کیا لیکن ڈاکٹر گھر جا چکا تھا ''ٹھیک ہے۔ صالحہ وہاب سے میری بات کرا دیجئے۔'' اس نے کہا۔

صالحہ فون پر آئی تو سفینہ نے اس سے پوچھا ''مس وہاب' آپ کب سے ڈاکٹر کے ساتھ ہیں؟''

''چار سال ہو گئے مس انصار لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ڈاکٹر نے اپنی بیٹی کا آپریشن خود کیا تھا یا کسی اور پلاسٹک سرجن سے کرایا تھا۔ میں تمہیں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ وہ دیکھنے میں کیسی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ بابرا ذیشان اور یاسمین قزلباش کو ڈاکٹر نے اپنی بیٹی کا چہرہ دیا ہے۔''

''مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈاکٹر کی کوئی بیٹی بھی ہے۔'' صالحہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اسے گیارہ برس پہلے قتل کیا گیا تھا۔ اس کا شوہر اس کے قتل کے الزام میں سزا کاٹ رہا ہے۔ اس کے خلاف فیصلہ کن گواہی ڈاکٹر سلمان نے دی تھی۔'' سفینہ نے کہا ''بہر حال مجھے ڈاکٹر سے لازمی طور پر بات کرنی ہے اور مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔ یہ بتاؤ' وہ پیر کو مطب میں ہوں گے؟''

''جی ہاں' ہوں گے لیکن ان کا پیر کا شیڈول بہت ٹائٹ ہے۔ چار بجے تک تو انہیں ایک منٹ کی فرصت بھی نہیں ہوگی۔''

''میں چار بجے پہنچ جاؤں گی لیکن تم ڈاکٹر کو میرے متعلق نہ بتانا۔'' سفینہ نے کہا پھر خیال آیا تو اس نے پوچھا ''ڈاکٹر کی گاڑی کیسی ہے؟''

''ان کے پاس ہمیشہ سے ایک ہی گاڑی ہے۔ سیاہ فاکس ویگن۔''

ریسیور پر سفینہ کی گرفت بہت سخت ہوگئی۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ وہ ہمیشہ سیاہ فاکسی ہی خریدتے ہیں۔''

"جی نہیں۔ بارہ سال سے وہ بھی سیاہ فاکسی استعمال کر رہے ہیں۔"
"شکریہ مس وہاب۔"

☆☆☆

جعفر سعید رات کو گھر پہنچا۔ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑے ہو کر وہ جگمگاتی عمارتوں اور بارونق سڑک کو دیکھتا رہا۔ پورے دن اسے یہ خیال ستاتا رہا تھا کہ اس نے کتنے طنزیہ زہریلے لہجے میں سفینہ کو یور آنر کہہ کر پکارا تھا۔ وہ رخصت ہونے کا کوئی اچھا انداز نہیں تھا۔

اسے اپنا آپ برا لگنے لگا۔ سفینہ اتنی پیاری' اتنی ہمدرد عورت تھی۔ بغیر کسی غرض کے وہ اس کیس پر کام کر رہی تھی۔ وہ فاطمہ سے جا کر ملی۔ ڈاکٹر سلمان سے الجھی۔ وہ مختار عظیم سے ملنے جیل تک چلی گئی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے مستقبل کو' اپنے خوابوں کو' جج کے عہدے کو بھی پس پشت ڈال دے۔ جبکہ اسے مختار کی بے گناہی پر کامل یقین بھی نہیں ہے۔ یقیناً میرا رویہ صرف خراب ہی نہیں' نازوا بھی تھا۔ مجھے اس سے معذرت کرنی چاہیے۔ چاہے وہ میری آواز سنتے ہی ریسیور پٹخ دے۔ میں نے یور آنر کہہ کر گویا اس پر خودغرض ہونے کا الزام لگایا۔ میں ہوں ہی اسی قابل۔

پھر اس نے سوچا کہ سفینہ کو مختار کی بے گناہی پر یقین نہیں لیکن اس نے دو امکانات کے دروازے بہرحال کھول دیئے ...... اور اب وہ ان پر کام کر سکتا ہے۔ ایک فاطمہ بیگم کی گواہی اور دوسرا ڈاکٹر سلمان کا ڈراؤنا کردار۔ آخر وہ ایک سے زیادہ عورتوں کو اپنی بیٹی کا چہرہ کیوں دے رہا ہے۔

اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا' گہری سانس لے کر ریسیور اٹھایا اور سفینہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

سفینہ گھر پہنچی اور اس نے آیا کو رخصت کیا۔ طوبیٰ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "آپ بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں ممی۔"

"ہاں بیٹی' آج میں نے بہت سخت دن گزارا ہے۔" سفینہ نے کہا "تم اپنی

سناؤ۔"

"جی میں ٹھیک ہوں۔ ممی آج رات کیا پکائیں گی؟"

"جو تم کہو۔"

"تو ہری مرچوں والا قیمہ پکائیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ فون طوبیٰ کی سہیلی کا تھا۔ طوبیٰ کورڈلیس لے کر اندر والے کمرے میں چلی گئی۔ سفینہ اپنی ڈاک کچن میں لے گئی اور اسے ٹٹولنے لگی۔ ایک سادہ لفافے نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس پر اس کا نام اور پتا ٹائپ کیا گیا تھا۔ اس نے لفافے کو چاک کیا۔ اس میں ایک تصویر تھی' جسے دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے۔

وہ پولورائڈ کیمرے سے لی گئی طوبیٰ کی تصویر تھی۔ تصویر میں وہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے پلٹ کر کیمرے کی طرف دیکھتی نظر آ رہی تھی۔

سفینہ پریشان ہوگئی۔ یہ کیا معما ہے۔ کس نے کھینچی ہے یہ تصویر ...... اور کیوں؟ یہ تصویر اسی دن کی ہے' جب طوبیٰ اس کار کو دیکھ کر ڈری تھی اور اس تصویر کو اسے بھیجنے کا کیا مطلب ہے؟ طوبیٰ کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس نے جلدی سے تصویر چھپالی۔

"ممی' نادیہ نے مجھے یاد دلایا ہے کہ آج مجھے ڈسکوری چینل دیکھنا ہے۔ آج کل جو ہمیں سائنس میں پڑھایا جا رہا ہے' اس پر پروگرام آنے والا ہے۔ تو ممی' میں یہ پروگرام دیکھوں گی تو آپ اس کا شمار تفریح میں تو نہیں کریں گی؟"

"نہیں بیٹا۔ جاؤ تم پروگرام دیکھو۔"

فون کی گھنٹی بجی۔ سفینہ نے ریسیور اٹھایا۔ اس بار دوسری طرف جعفر سعید تھا۔ وہ معذرت کر رہا تھا لیکن سفینہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ "جعفر ابھی مجھے ڈاک میں طوبیٰ کی تصویر موصول ہوئی ہے۔ طوبیٰ نے ٹھیک کہا تھا کہ کار والا اسے دیکھ رہا تھا۔" اس نے تفصیل بتائی' پھر بولی "اگر وہ اسے اٹھا کر زبردستی گاڑی میں ڈال لیتا تو؟"

جعفر نے اس کی آواز میں خوف اور مایوسی کو محسوس کرتے ہوئے کہا ”سفینہ بیگم' پریشان نہ ہو۔ میں آدھے گھنٹے میں تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔“

☆☆☆

ڈاکٹر سلمان اپنی لائبریری میں بیٹھا معمول کے مطابق کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید کل اس نے بابرا کا تعاقب کر کے غلطی کی ہے۔ سگنل کی بتی سرخ ہوئی تو اسے اس بلڈنگ کے سامنے ہی کار روکنی پڑی' جہاں بابرا رہتی تھی۔ ممکن ہے' بابرا نے اسے دیکھ لیا ہو۔ دوسری طرف یہ بھی تھا کہ اس نے دیکھا ہو اور اسے اہمیت نہ دی ہو۔ کوئی بھی شخص' کسی بھی وقت' کسی بھی سڑک سے گزر سکتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہوتی۔

لیکن اسے یوں سرسری طور پر دیکھنا اس کے لیے ناکافی تھا۔ وہ اسے صحیح معنوں میں دیکھنا' اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ نازنین نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کوئی بھی نہیں ہو سکتا لیکن بہرحال وہ نازنین جیسی تو تھی۔ پہلے وہ کیسی تھی۔ بے رنگ ...... اور اب ...... اب تو وہ خود بھی اپنے حسن کی عادی ہو گئی تھی۔

اس نے نازنین کا تصور کیا اور مسکرا دیا۔ نازنین کا حسن' اس کا شاداب جسم' اس کی چال' اس کی ادائیں! راہ چلتے لوگ رک جاتے تھے اور اسے پلٹ کر دیکھتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ وہ کیسے ایک دم تبدیل ہو گئی ہے۔ اس پر نازنین نے کہا تھا ”مجھے آپ نے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے لیکن میں نے اپنی سوتیلی بہنوں سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں ان جیسی بننے کی آرزو جو کرتی تھی۔“

لیکن آخر میں وہ سہانا خواب ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہو گیا۔ نازنین اس سے کتنی محبت کرتی تھی' کتنا احترام کرتی تھی اس کا لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ سب گھٹنے لگا اور گھٹتے گھٹتے معدوم ہو گیا۔ اب وہ اس کے مشورے نہیں سنتی تھی۔ ابتدا میں وہ فلرٹ کرتی تھی لیکن آخر میں وہ اس سے بہت آگے چلی گئی۔ وہ اسے سمجھاتا' تنبیہ کرتا کہ وہ آگ سے کھیل رہی ہے۔ جل جائے گی۔ اس کی حرکتوں کا مختار کو پتا چل گیا تو وہ اسے قتل بھی کر سکتا ہے۔ اتنی حسین اور دلربا بیوی کا شوہر کسی بھی وقت قاتل بن سکتا ہے۔

پیالی خالی کرتے کرتے ڈاکٹر کا وجود غصے سے بھر گیا۔ اب وہ اس کاملیت کو کبھی نہیں پہنچ سکتا' جو اس نے نازنین کے ذریعے حاصل کی تھی۔ اب رعشے کی وجہ سے کوئی آپریشن بگڑ بھی سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہی اسے سرجری چھوڑنی ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پارکنسن مرض کے ابتدائی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

بابرا' نازنین تو نہیں تھی لیکن اس کے تمام مریضوں میں وہی اس کے جینئس ہونے کا ثبوت تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ملایا۔ بابرا کی آواز میں تازگی تھی۔

”ہیلو بابرا' میں ڈاکٹر سلمان بول رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

دوسری طرف ایسا لگا' جیسے بابرا کی سانس رک گئی ہو پھر اس نے جلدی سے کہا ”آپ کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب۔“

بابرا کی آواز سے بے اعتنائی بالکل واضح تھی پھر بھی ڈاکٹر اپنا مدعا کہے بغیر نہ رہ سکا ”مجھ پر ایک کرم کرو گی مس ذیشان۔ دراصل کل میں فارغ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کل رات کے کھانے پر تم مجھے کمپنی دے دو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ میں ساڑھے سات بجے تمہیں پک کرلوں گا۔“

”میں ...... میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“

”پلیز بابرا ...... پلیز۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔ ”تم ہمیشہ کہتی ہو کہ تمہاری یہ نئی زندگی میری مرہون منت ہے۔ تو تم اس زندگی میں سے دو گھنٹے میرے لیے نہیں نکال سکتیں۔“

”کیوں نہیں ڈاکٹر۔“

”بس تو ٹھیک ہے۔ ساڑھے سات بجے ...... رائٹ؟“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر۔“

بابرا کا لہجہ ایسا تھا' جیسے ڈاکٹر نے اسے مجبور کر کے اقرار کرایا ہو۔ ڈاکٹر نے سوچا اور ریسیور رکھ دیا اور اگر یہ درست ہے تو وہ اپنے رویے میں بھی نازنین سے مماثل ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ارشد جمال کو رہ رہ کر کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ دن بھر وہ ایرانی قالینوں کی عاشق ایک خاتون کے ساتھ بازار میں گھومتا رہا تھا۔ وہ خاتون ایک مالدار بیوہ

تھی جس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ لیکن وہ اس پیسے کو دو نمبر چیزوں پر ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے وہ ارشد جمال سے مدد لے رہی تھی۔

دن گزر گیا لیکن شاہین نامی اس خاتون کو اپنے مطلب کا قالین نظر نہیں آیا۔ ارشد بھی بور ہو گیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس سے جان چھڑائے لیکن شاہین اصرار کر کے اسے لنچ کے لیے مون لائٹ لے گئی۔ اس کے نتیجے میں ارشد کا موڈ بھی کچھ بحال ہو گیا۔

''ارے میں بتانا بھول ہی گئی۔'' کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے شاہین نے اچانک کہا ''وہ میری کزن عذرا کے گھر چوری ہوئی تھی نا......''

''ہاں۔ آپ نے بتایا تھا۔'' ارشد نے بیزاری سے کہا۔ وہ واردات اسی نے کی تھی۔

''کل عذرا کو محکمہ سراغ رسانی کی طرف سے ایک فوٹو بھجوایا گیا ہے۔'' شاہین نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ ''ابھی حال ہی میں سردھام میں ایک واردات ہوئی۔ وہاں ایک پوشیدہ کیمرے نے ڈاکو کی تصویر لے لی۔ سراغرسانی والوں کا خیال ہے کہ یہ وہی ڈاکو ہے جو متعدد وارداتیں کر چکا ہے۔''

ارشد کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ وہ عذرا سے تین چار بار ملا تھا اور پچھلے پانچ برسوں میں تو اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ خدا کرے اس کو تصویر دیکھ کر اس کا خیال نہ آیا ہو۔ ''تصویر صاف اور واضح ہے؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔

شاہین ہنسنے لگی ''ارے نہیں۔ عذرا کہہ رہی تھی کہ بس ناک اور ہونٹ کسی حد تک واضح ہیں۔ اس نے تصویر ڈسٹ بن میں پھینک دی تھی۔''

ارشد نے سکون کی سانس لی۔

''تصویر کے ساتھ لفظی خاکہ بھی تھا۔ اس کے مطابق وہ ڈاکو خطرناک ہے۔'' شاہین کہتی رہی ''وہ رکن قومی اسمبلی قمر جاوید کی ماں کے قتل کے سلسلے میں بھی پولیس کو مطلوب ہے۔''

ارشد کے اعصاب تن گئے۔ کم بخت اسے اس بڑھیا کے قتل میں ملوث کر

رہے ہیں۔

اپنے گھر واپس جاتے ہوئے وہ اس رات کے بارے میں سوچتا رہا' جب اس نے قمر جاوید کے گھر پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ اس کی دانست میں مکان خالی تھا۔ گھر کے تمام لوگ ایک دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ وہ بڑے سکون سے قیمتی چیزیں ہال وے میں لا کر رکھ رہا تھا کہ اچانک قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے بمشکل اپنا چہرہ چھپایا تھا کہ ہال وے روشنی میں نہا گیا۔

''اوہ......میرے خدا۔'' اسے لرزیدہ آواز سنائی دی۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ رکن اسمبلی کی ماں ہے۔

اس کا قتل کا ارادہ نہیں تھا۔ اس نے سونے کی نقاشی والے فریم کو اپنے چہرے کے سامنے کر رکھا تھا۔ اسی پوزیشن میں وہ بوڑھی عورت کی طرف لپکا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے گرا دے گا اور اس کا چشمہ اتار لے گا۔ وہ جانتا تھا کہ چشمے کے بغیر اسے کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔

لیکن ہوا یہ کہ فریم کا کونا بڑی بی کے سر سے ٹکرایا اور کچھ زیادہ ہی قوت سے ٹکرایا۔ وہ زینے پر لڑھکتی چلی گئی اور اس کے حلق سے جو آخری آواز نکلی تو اسے دیکھنے سے پہلے ہی اس نے جان لیا کہ وہ مر چکی ہے۔ اس واقعے کے بعد مہینوں وہ خوف زدہ رہا۔ وہ راستہ چلتے چلتے پلٹ کر دیکھتا۔ اسے لگتا کہ کوئی پولیس والا اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگانے کے لیے چلا آ رہا ہے۔

تو کیا اب اسے فرار ہو جانا چاہیے۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ دولت اس کے پاس کافی تھی۔ وہ ملک ہی نہ چھوڑ دے لیکن پھر اس نے سوچا کہ تصویر غیر واضح ہے تو بلا وجہ کیوں ڈرے۔

گھر پہنچتے پہنچتے وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس تصویر کے سوا اس نے کہیں کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔ لہٰذا بلا وجہ خوف زدہ ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں' یہ ضروری ہے کہ کچھ عرصہ سکون سے گزارا جائے۔

سوا چار بجے وہ گھر پہنچا اور ڈاک کا جائزہ لیا۔ ایک خط پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ لفافے میں سے جو کچھ نکلا اس نے اسے قہقہے لگانے پر مجبور

کر دیا۔ ارے اس پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ لفافے میں وہی تصویر تھی، جس کا شاہین نے تذکرہ کیا تھا۔ اس کی اپنی تصویر لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کی تصویر ہے۔ اس تصویر میں وہ چہرے پر چڑھا ہوا موزہ ہٹا کر کانسی کے اس مجسمے کو بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے تصویر کو بے پروائی سے اچھالا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ شاہین کی باتیں سن سن کر وہ تھک چکا تھا۔ چنانچہ وہ سو گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تو چھ بجے والی خبروں کا وقت ہو رہا تھا۔ اہم ترین خبر یہ تھی کہ امتیاز حیدر کا دست راست فواد اصغر وعدہ معاف گواہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اٹارنی جنرل سے اشارتاً کہا تھا کہ اس کے انکشاف کے نتیجے میں امتیاز کا تعلق ایک ایسے قتل سے ثابت ہو سکتا ہے، جس کی سزا ایک بے قصور شخص بھگت رہا ہے۔

اس معاملے میں جو کچھ میں حاصل کر سکتا ہوں، کوئی نہیں کر سکتا۔ اس نے بڑی طمانیت سے سوچا۔ یہ الگ بات کہ ایسا کبھی ہو گا نہیں۔

☆☆☆

ادھر اطلاعی گھنٹی بجی، ادھر وہ سائنس پروگرام ختم ہوا جو طوبیٰ دیکھ رہی تھی۔ جعفر کی آواز سن کر وہ خوشی سے دوڑتی ہوئی آئی لیکن اسے اپنی ممی اور جعفر، دونوں کے چہروں پر سنجیدگی نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ شاید دونوں میں لڑائی ہو گئی ہے اور اب وہ صلح کی کوشش کر رہے ہیں۔

کھانے کے دوران میں سفینہ خاموش رہی۔ جعفر اپنی بہنوں کے قصے سنا کر ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر رہا تھا...... اس وقت وہ طوبیٰ کو اور اچھا لگا...... کسی فلمی ہیرو کی طرح۔ طوبیٰ کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ اس کی ممی جعفر انکل کی بات دھیان سے نہیں سن رہی ہیں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ دونوں آپس میں بات کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پا رہے ہیں۔ شاید کمرے میں اس کی موجودگی کی وجہ سے۔ لہٰذا اس نے قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے سائنس کا کام ویسے بھی کرنا تھا۔ اس نے برتن سمیٹنے میں ماں کی مدد کی اور پھر اعلان کیا کہ اسے ہوم ورک کرنا ہے۔ یہ سن کر ممی کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔

طوبیٰ کے جانے کے بعد جعفر نے سفینہ سے کہا ”اب مجھے وہ تصویر دکھاؤ۔“

سفینہ نے تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔ جعفر نے تصویر کا جائزہ لیا اور بولا ”طوبیٰ نے جو کچھ کہا، حرف بہ حرف درست تھا۔“

”اور طوبیٰ نے یہ بھی کہا تھا کہ کار اسے کچلنے کے لیے اس کی طرف بڑھی تھی۔ لیکن جعفر، ایسا کوئی کیوں کرے گا؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سنگین معاملہ ہے۔ تم نے وقاص کو اطلاع دی اس بات کی؟“

”خدا کی پناہ۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ یہ تو بہت ضروری ہے۔“

”بالکل۔ آخر وہ اس کی بھی بیٹی ہے۔“ جعفر نے کہا ”سنو سفینہ، میں کافی بنا رہا ہوں اتنی دیر میں تم وقاص کو فون کر دو۔“

سفینہ نے وقاص کے گھر کا نمبر ملایا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی شگفتہ کے لہجے میں سرد مہری تھی ”وہ تو ابھی آفس میں ہی ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو دے دیں۔“

کیسا پیغام؟ یہ کہ اس کی سب سے بڑی بیٹی خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ سفینہ نے سوچا اور ماؤتھ پیس میں کہا ”میں دفتر فون کر لوں گی۔ شکریہ شگفتہ۔“

☆☆☆

طوبیٰ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس کی تفصیل سنتے ہوئے وقاص کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اسے اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ یہ اسٹائل ہی امتیاز حیدر کا تھا۔ وہ اعصابی جنگ لڑتا تھا اور ہر لمحے دباؤ بڑھاتا جاتا تھا۔ اگلے ہفتے وہ ایک اور تصویر بھیجے گا۔ ساتھ میں نہ کوئی تحریر، نہ دھمکی۔ صرف تصویر۔ پیغام خود ہی سمجھ لو ورنہ بھگتنے کے لیے تیار رہو۔

وقاص نے ریسیور رکھا اور میز پر پوری قوت سے گھونسا مارا۔ یہ امتیاز حد سے گزر رہا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ اس کا سب سے معتمد راز دار فواد اصغر پولیس سے مذاکرات کر رہا تھا اور اگر فواد کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی کہ نازنین مرڈر کیس پر دوبارہ کام کیا جا رہا ہے تو اس کی بن آئے گی۔ تب پولیس اسے نظر انداز نہیں کر

سکے گی۔

امتیاز نے سوچا ہوگا کہ سفینہ مجھے ضرور اطلاع دے گی۔ اس نے سوچا۔ امتیاز مجھے کہے بغیر یہ چاہتا ہے کہ سفینہ کو گڑے مردے اکھاڑنے سے باز رکھوں لیکن امتیاز کو اس بات کا علم نہیں کہ سفینہ کو ڈرایا نہیں جا سکتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ تصویر اسے ڈرانے کی بجائے اور بھڑکا دے گی۔ وہ ضد پکڑ لے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر سلمان' بابرا کو ایک بہت مہنگے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ اس نے بابرا کو اس کے گھر سے پک کیا تھا۔ بابرا پوری طرح تیار تھی۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ اپنے فلیٹ میں ایک لمحہ بھی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ یہ رویہ ڈاکٹر کے لیے بے حد دل شکن تھا۔

لیکن ریسٹورنٹ میں اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان اس کا رویہ بہتر ہوگیا۔ وہ پرسکون نظر آنے لگی ''میں ابھی پوری طرح اس نئی صورتحال کی عادی نہیں ہوئی ہوں۔'' اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

ڈاکٹر کو نازنین یاد آگئی۔ ابتدا میں وہ بھی یہی کہتی تھی لیکن بعد میں وہ کتنی ناشکر گزار ہوگئی۔ میں اس سے مانگتا ہی کیا تھا۔ اب کیا کسی فنکار کو اپنی تخلیق دیکھ کر خوش ہونے کا حق بھی نہیں مل سکتا۔ اس نے سوچا۔

لمحے گزرتے گئے۔ ڈاکٹر کا وجود اعتماد اور جوش سے بھرتا گیا۔ اس مہنگے ریسٹورنٹ میں کتنی حسین عورتیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود تقریباً تمام مردوں کی نگاہیں رہ رہ کر بابرا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس نے یہ بات بابرا سے بھی کہی۔ بابرا نے بڑی بے نیازی سے سر جھٹک دیا۔

''اتنی بے نیازی نہ ظاہر کرو نازنین۔'' ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا ''یہ میرے لیے توہین آمیز ہے۔''

بابرا کو اس کے گھر پہنچانے کے بعد اپنے گھر جاتے ہوئے ڈاکٹر کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ کہیں وہ بابرا کو نازنین کہہ کر تو نہیں پکارتا رہا ہے اور اگر ایسا ہوا ہے تو کتنی بار ہوا ہے۔ اس نے سرد آہ بھری اور پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں

موند لیں۔ وہ اس وقت ٹیکسی میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نازنین کی ایک جھلک ...... صرف ایک جھلک دیکھنے کی خاطر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر نازنین کے گھر کے سامنے سے گزرنا کتنا آسان تھا۔ نازنین زیادہ تر ٹی وی کے سامنے بیٹھی ہوتی تھی اور وہ کھڑکیوں کے پردے کھینچنے کی زحمت کبھی نہیں کرتی تھی۔ وہ اسے اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھی نظر آتی۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ اسے مختار عظیم کے ساتھ کاؤچ پر بیٹھے دیکھنے پر مجبور ہوتا۔ ان کے کندھے آپس میں جڑے ہوتے۔ یہ وہ قربت تھی' جو اسے نصیب نہیں تھی۔

اس نے سر جھٹکا اور بابرا کے بارے میں سوچنے لگا۔ بابرا شادی شدہ نہیں تھی اور اس کی زندگی میں شاید کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ اس نے آج بابرا سے کہا تھا ...... تکلف چھوڑو۔ تم مجھے سلمان کہا کرو اور ہاں' اگر وہ اسے وہ بریسلیٹ دے دے' جو نازنین موت کے وقت پہنے ہوئے تھی۔ ہوسکتا ہے' بابرا اس سے خوش ہو اور کچھ متاثر بھی ہو جائے۔

اس نے نازنین کو جہیز میں کافی زیورات دیے تھے۔ خوب صورت اور قیمتی زیورات۔ لیکن پھر نازنین نے دوسرے مردوں سے تحفے میں زیورات قبول کرنے شروع کر دیے تھے اور وہ اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کرتی تھی۔ مختار سے ...... کہ وہ زیورات اس نے نازنین کو دیے ہیں۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ڈاکٹر کی وہ خوشی خوشبو کی طرح اڑ گئی جو بابرا کے ساتھ گزرے ہوئے وقت نے اسے دی تھی۔

☆☆☆

جعفر نے سفینہ کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔ اپنے سابقہ شوہر سے بات کرنے کے بعد اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ اور اس کی آنکھوں میں دبی دبی اداسی نظر آرہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اسے لپٹا لے۔ اسے دلاسا دے۔ اس سے کہے کہ وہ خود کو اتنا اکیلا نہ سمجھے لیکن وہ جانتا تھا کہ سفینہ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔ سفینہ انصار کسی سے سہارے کی امید نہیں رکھتی تھی۔ وہ کسی سے مدد نہیں چاہتی تھی۔

اس نے گزشتہ روز کے رویے پر معذرت کی ''میں نے بہت زیادتی کی۔''

اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ اگر تمہیں مختار عظیم کی بے گناہی پر یقین ہوتا تو تم اس کی مدد کرتے ہوئے کبھی نہ ہچکچاتیں۔ تم جج شپ کی بھی پروانہ کرتیں۔"

کیا یہ سچ ہے؟ سفینہ نے یہ سن کر سوچا۔ کیس فائل میں اسے امتیاز حیدر کا جو حوالہ ملا تھا' فی الوقت وہ اس کے بارے میں جعفر کو نہیں بتا سکتی تھی۔ ابھی سب سے پہلے اسے ڈاکٹر سلمان سے ملاقات کرنا تھی۔ اس نے انکار کیا تھا کہ اس نے نازنین کے چہرے کی سرجری نہیں کی لیکن اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ اس نے اسے کسی اور کے پاس سرجری کے لیے بھیجا تھا۔

جعفر رخصت ہو رہا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے گیٹ تک گئی۔ دونوں چند لمحے گیٹ پر کھڑے رہے "مجھے تمہارے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔" جعفر نے اس سے کہا "اور یہ بھی سن لو کہ اس کا سبب مختار عظیم کا کیس ہرگز نہیں ہے۔" پھر وہ پلٹ کر چل دیا۔ اس میں سفینہ کا ردعمل دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

☆☆☆

جمعہ۔ 3 نومبر!

فواد اصغر استغاثہ سے معاملہ کرنے کے لیے بے چین تھا لیکن ابھی تک اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ جمعے کی صبح سات بجے اس نے اپنے وکیل مبین چودھری سے اس کے دفتر میں ملاقات کی۔ مبین چودھری بہت خوش لباس آدمی تھا اور کیونکہ اس کی وکالت کامیاب تھی اس لیے وہ مہنگے ملبوسات افورڈ کر سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر فواد صرف کڑھ سکتا تھا کیونکہ امتیاز حیدر نے کبھی اسے اچھی تنخواہ نہیں دی تھی۔ اسے کبھی خوش حالی میسر نہیں آئی تھی اور اب وہ امتیاز حیدر کے کیے کی سزا بھگتنے والا تھا۔ یعنی ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا اور زندگی مفت میں برباد ہوگئی۔

فواد نے عمر بھر ایک چیز سے بہت فائدہ اٹھایا تھا اور وہ یہ کہ وہ صورت سے

بے وقوف لگتا تھا۔ لوگ اسے اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کوئی اس پر دوسری نظر نہیں ڈالتا تھا۔ خود امتیاز کے قریبی آدمی بھی اسے گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس نے امتیاز حیدر کی بلیک منی کو سرمایہ کاری کے ذریعے قانونی بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے امتیاز کے بینک اکاؤنٹس کا حساب بھی وہی رکھتا تھا۔

"تم سرکاری گواہ بن سکتے ہو۔" مبین چودھری کہہ رہا تھا "لیکن تمہیں پانچ سال کی سزا پھر بھی بھگتنی ہوگی۔"

"یہ تو بہت ہے۔" فواد نے منہ بنا کر کہا۔

"دیکھو' تم کہتے ہو کہ تم امتیاز کو قتل کے ایک کیس میں ملوث کرا سکتے ہو۔ صورتحال یہ ہے کہ یا تم سب کچھ بتا دو یا پھر منہ بند ہی رکھو۔ استغاثہ کو اس چیز کی ضرورت ہے۔ اگر امتیاز کو قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا ہو جاتی ہے تو اس کی تنظیم اپنی موت آپ مر جائے گی۔ تو یہ سمجھ لو کہ استغاثہ کی ضرورت یہ ہے۔ تم اسے پورا کرو تو وہ تمہیں رعایت دیں گے ورنہ نہیں۔"

"اسے ملوث میں کرا سکتا ہوں۔ جرم ثابت کرنا استغاثے کا کام ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم ادھر ادھر اپنے حلقے میں باتیں کرنے کے بجائے مجھ پر اعتماد کرو۔ صرف مجھ سے بات کرو ورنہ خود سوچو' میں تمہاری مدد کیسے کروں گا۔"

ایک لمحے کو فواد کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں مگر فوراً ہی دور بھی ہوگئیں "ٹھیک ہے' میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تمہیں جانم مرڈر کیس یاد ہے۔ اس حسین عورت کا قتل' جس کی لاش پر گلاب کے پھول بکھیر دیے گئے تھے۔ یہ وہ کیس ہے' جس سے اظہر عباس کو شہرت ملی تھی۔"

چودھری نے اثبات میں سر ہلایا "مجھے یاد ہے۔ عورت کے شوہر کو سزا ہوئی تھی لیکن کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ امتیاز حیدر اس میں ملوث تھا؟"

"تمہیں یاد ہوگا۔ متوفیہ کے شوہر نے کہا تھا کہ گلاب کے ان پھولوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ نازنین کو وہ پھول امتیاز نے بھجوائے تھے۔ قتل کی رات میں خود وہ پھول اس کے گھر لے کر گیا تھا۔ پھولوں کے ساتھ

امتیاز کا لکھا ہوا کارڈ بھی تھا۔ میں تمہیں وہ الفاظ لکھ کر دیتا ہوں' جو اس کارڈ پر لکھے تھے۔'' فواد نے جیب سے قلم نکالا' کاغذ اپنی طرف گھسیٹا اور اس پر کچھ لکھنے لگا پھر اس نے وہ کاغذ چودھری کی طرف بڑھا دیا ''امتیاز نازنین کو جانم کہا کرتا تھا۔'' اس نے مزید کہا'' اور یہ بھی سن لو کہ ان دونوں کے درمیان اس رات ملاقات طے تھی۔''

مبین چودھری نے کاغذ کی تحریر پڑھی۔ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں جانم۔ تم جان جہاں نہ بنو۔'' اس کے آگے دو حروف تھے: (الف۔ ح ...... برائے امتیاز حیدر) ''وہ کارڈ کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ اہم بات ہے۔ وہ کارڈ قتل کے بعد وہاں موجود نہیں تھا۔ امتیاز اس عورت پر جان چھڑکتا تھا اور وہ دوسرے مردوں سے ملتی تھی۔ تو وہ پاگل ہو جاتا تھا۔ اس نے پھولوں کے ساتھ اسے الٹی میٹم بھی بھجوایا تھا کہ اسے اپنے شوہر سے طلاق لینی ہے اور دوسرے لوگوں سے تعلقات بھی ترک کرنے ہیں۔''

''اس عورت کا ردعمل کیا تھا؟''

''وہ اسے جلا کر خوش ہوتی تھی۔ وہ امتیاز کے ساتھیوں میں سے کسی نے اسے سمجھایا تھا کہ امتیاز خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اس معاملے میں حد سے گزر گئی تھی۔ وہ جو اس کی لاش پر پھول بکھرے ملے' یہ امتیاز ہی کا غصے کا اسٹائل ہے۔''

''لیکن کارڈ موجود نہیں تھا۔''

فواد نے کندھے جھٹک دیے ''مقدمے کے دوران میں کبھی اس کا تذکرہ نہیں ہوا اور مجھے منہ بند رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ امتیاز کو ستاتی تھی' اسے رات رات بھر انتظار کی اذیت میں مبتلا رکھتی تھی۔ دو تین افراد ایسے ہیں' جنھوں نے مجھے بتایا کہ امتیاز نے مشتعل ہو کر اسے قتل کر دیا تھا۔ ایک بات اور۔ امتیاز نے نازنین کے لیے کچھ بہت مہنگے زیورات خریدے تھے۔ ان کی ادائیگی میں نے کی تھی اور ان کی رسید بھی میرے پاس ہے۔ مقدمے کے دوران میں زیورات کے متعلق بہت بات ہوئی تھی۔ مقتولہ کے شوہر کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کے پاس ایسے زیورات بھی دیکھے تھے' جو اس کے دیے ہوئے نہیں تھے لیکن مقتولہ کے

باپ نے ایسے تمام زیورات کے بارے میں حلفیہ بیان دیا کہ وہ اس نے اپنی بیٹی کو دیے تھے۔''

مبین چودھری نے فواد کا تحریر کردہ کاغذ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اب بات ضرور بن جائے گی۔'' اس نے کہا'' اور اس سے اظہر عباس کو بھی نقصان پہنچے گا۔''

وہ دونوں مسکراتے ہوئے اٹھے۔ مبین اسے چھوڑنے کے لیے باہر آیا۔ انہوں نے لفٹ کو بلانے کے لیے بٹن دبایا۔ لفٹ آئی۔ دروازہ کھلنے لگا۔ اسی پل فواد اصغر کی چھٹی حس نے اسے نامعلوم خطرے کا احساس دلایا۔ اس نے پلٹ کر بھاگنا چاہا۔

لیکن اسے مہلت نہیں ملی۔ اس کی موت فوراً ہی واقع ہوگئی پھر دو گولیاں مبین چودھری کے سینے میں پیوست ہوئیں اور وہ بھی گرتا چلا گیا۔

☆☆☆

سفینہ نے دہرے قتل کی خبر دفتر جاتے ہوئے اپنی کار کے ریڈیو پر سنی۔ لاشیں مبین چودھری کی سیکرٹری نے دریافت کی تھیں۔ پولیس کا کہنا تھا کہ بظاہر وہ ڈکیتی کی واردات معلوم ہوتی ہے۔ شاید ان دونوں نے لٹیروں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایک صحافی نے انسپکٹر سے چبھتا ہوا سوال کیا'' اس قتل کا سبب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فواد اصغر اپنے باس امتیاز حیدر کو برسوں پہلے ایک قتل میں ملوث کر کے اپنی جان بچانے کی فکر کر رہا تھا۔ کیا یہ اس دہرے قتل کا محرک نہیں ہو سکتا؟''

''نو کمنٹ۔'' انسپکٹر نے خشک لہجے میں کہا۔

سفینہ نے ریڈیو آف کرتے ہوئے سوچا کہ یہ معاملہ اتنا سطحی نہیں۔ یہ انداز تو گینگ سٹرز کا سا ہے اور امتیاز حیدر اس میں ملوث معلوم ہوتا ہے۔ اس خیال نے کہ وقاص مرزا امتیاز حیدر کا وکیل ہے' اسے پریشان کر دیا۔ یہ کیسے الجھاوے ہیں؟''

☆☆☆

وقاص مرزا کو یہ خبر نو بج کر دس منٹ پر عدالت کے احاطے میں ملی۔ پریس

والوں نے اسے گھیر لیا۔ خبر سنتے ہی اسے احساس ہوا کہ غیر شعوری طور پر وہ اس کی توقع کر رہا تھا۔ امتیاز حیدر اتنا احمق نہیں تھا کہ فواد جیسے رازدار کو اپنے خلاف گواہی دینے کا موقع دیتا۔

اس نے یہ ظاہر کیا' جیسے اس اطلاع سے اسے شاک پہنچا ہے اور وہ رکا بھی نہیں۔ پریس والوں سے جان چھڑا کر وہ اندر چلا گیا۔

امتیاز اندر موجود تھا ''فواد کا پتا چلا تمہیں؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں' ابھی معلوم ہوا ہے۔''

''امن و امان کی صورتحال کتنی خراب ہے۔ کوئی کہیں بھی محفوظ نہیں۔ ڈاکو کہیں بھی گھس جاتے ہیں اور عدالتیں ہم جیسوں کو پریشان کرتی ہیں۔ یہ سب پولیس کی خرابیاں ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔''

''بہرحال اس سے معاملات کا توازن ہمارے حق میں کچھ بہتر ہو گیا ہے۔'' امتیاز نے کہا۔

''یہ بھی درست ہے۔''

''لیکن مجھے کھیل کا یہ میدان پسند نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''ظاہر ہے۔تم سے زیادہ کون جانے گا۔''

وقاص نے بے حد محتاط لہجے میں کہا ''امتیاز صاحب' کسی نے میری سابقہ بیوی کو میری بیٹی کی ایک تصویر بھیجی ہے۔ وہ تصویر منگل کے روز اس وقت کھینچی گئی تھی' جب طوبیٰ اسکول جا رہی تھی۔ طوبیٰ کا کہنا ہے کہ گلی میں کھڑی ایک کار اسے کچلنے کی غرض سے بڑھی تھی لیکن عین موقع پر یوٹرن لے کر واپس چلی گئی تھی۔''

''کوئی اناڑی ڈرائیور ہوگا۔'' امتیاز نے بے پروائی سے تبصرہ کیا۔

''امتیاز صاحب' بہتر یہی ہوگا کہ میری بیٹی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔''

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ارے ہاں' تمہاری سابقہ بیوی جج بننے والی ہے۔ اچھا ہے' وہ اچھی پروسیکیوٹر نہیں ہے۔ اسے دوسروں کے

معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔''

وقاص جانتا تھا کہ اس کی بات سمجھ بھی لی گئی اور جواب بھی دے دیا گیا ہے۔ یہ طے تھا کہ طوبیٰ کی تصویر امتیاز کے کسی آدمی نے کھینچی ہے اور اب اسے سفینہ کو قائل کرنا ہوگا کہ وہ نازنین کے قتل کے کیس میں ٹانگ اڑانے سے باز رہے اور یہی نہیں' خود وقاص کو امتیاز کو اس کیس سے بری کرانے کے لیے پورا زور لگانا ہوگا۔

''گڈ مارننگ حیدر۔ مارننگ وقاص۔''

وقاص نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے اس کا سسر ریحان جعفری کھڑا تھا۔ پھر وہ امتیاز کے برابر والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''فواد اصغر اور مبین چودھری کا سن کر دکھ ہوا۔'' اس نے کہا۔

''بے حد المناک واقعہ ہے۔'' امتیاز حیدر نے تبصرہ کیا۔

اسی وقت پیش کار نے آ کر کہا کہ جج صاحب نے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی کو اپنے چیمبر میں طلب کیا ہے۔

جسٹس اکمل کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ انہوں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرا خیال ہے' آپ سب لوگوں کو فواد اصغر اور مبین چودھری کے قتل کا علم ہو چکا ہے۔''

دونوں وکیلوں نے اثبات میں سر ہلائے۔

''اس کیس میں پہلے ہی کافی تاخیر ہو چکی ہے۔'' جسٹس اکمل نے کہا ''اس لیے میرے خیال میں ہمیں التوا سے بچنا چاہیے۔''

وہ سب عدالت میں چلے گئے۔ وقاص پریشان تھا۔ جج نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن وقاص کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس دہرے قتل کا ذمے دار امتیاز حیدر کو ہی سمجھ رہا ہے اور اس کا یہ سمجھنا غیر فطری بھی نہیں تھا۔

امتیاز حیدر نے راہ کے کانٹے تو ہٹا دیے تھے لیکن اپنا راستہ خود دشوار بھی کر لیا تھا۔

☆☆☆

سفینہ پانچ بجے دفتر سے اٹھ رہی تھی کہ وقاص کا فون آ گیا۔ سفینہ کو اس کی آواز میں کھچاؤ محسوس ہوا "سفینہ مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا "ابھی ایک گھنٹے میں تو تم گھر پہنچ جاؤ گی نا۔"

"ہاں میں ابھی نکل ہی رہی تھی۔"

"بس تو میں بھی پہنچ رہا ہوں۔" وقاص نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

سفینہ سوچ میں پڑ گئی ایسی کون سی اہم بات ہے کہ وہ گھر آ رہا ہے۔ کیا وہ طوبیٰ کی تصویر والے معاملے میں فکر مند ہے۔ اسے وہ دن یاد آ گئے، جب وہ دفتر سے گھر جاتے ہوئے صرف اس لیے خوش ہوتی تھی کہ وہاں وہ وقاص کے ساتھ وقت گزار سکے گی۔

وہ گھر پہنچی تو طوبیٰ نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ممی آج مجھے آیا اسکول سے لینے آئی تھی۔ کیوں؟ مجھے اتنی شرم آئی ممی۔"

سفینہ نے آیا کو دیکھا، جو بیٹھی ہوئی تھی "تم اب گھر جاؤ بوا۔ شکریہ۔"

آیا کے جانے کے بعد سفینہ نے طوبیٰ کو دیکھا۔ وہ بہت غصے میں تھی "وہ کار جسے دیکھ کر تم ڈر گئی تھیں......" اس نے کہا اور پوری تفصیل سنا دی۔

سب کچھ سننے کے بعد طوبیٰ نے کہا "ممی...... یہ بہت ڈراؤنی بات ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں۔"

"آپ نے مجھے کل رات ہی کیوں نہیں بتا دیا؟"

"کیسے بتاتی۔ میں خود بہت ڈر گئی تھی۔"

"تو اب ہم کیا کریں گے ممی؟"

"ہم احتیاط کریں گے جب تک کہ ہمیں پتا نہیں چل جاتا کہ یہ کس کی حرکت ہے اور اس نے کیوں ایسا کیا؟"

"ممی، اگر وہ اگلی بار آیا تو کیا مجھے کار سے کچل دے گا؟"

بچی کے خوف نے، اس کے اس سوال نے سفینہ کو دہلا دیا۔ اس نے بڑھ کر طوبیٰ کو لپٹا لیا، "اب انشاء اللہ اسے یہ موقع نہیں ملے گا۔" اس نے کہا۔

"ڈیڈی کو اس بات کا پتا ہے ممی؟"

"ہاں۔ میں نے رات انہیں فون کیا تھا۔ ابھی وہ یہاں آنے والے ہیں۔"

طوبیٰ تن کر بیٹھ گئی۔ "ڈیڈی کو میری فکر ہے نا۔"

سفینہ نے سوچا، بچے کتنے معصوم ہوتے ہیں۔ طوبیٰ اپنا خوف بھول کر خوش ہو گئی اور وہ یوں ممنون ہو رہی تھی، جیسے وقاص اس پر احسان کر رہا ہو۔ "ظاہر ہے وہ تمہارے لیے پریشان تو ہوں گے۔" اس نے کہا۔

"ممی، میں اپنی سہیلیوں کو اس بارے میں بتا سکتی ہوں؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ پہلے حقیقت کھل جائے پھر بتا دینا۔"

"اور ممی، وہ جو بھی ہے، اسے ہتھکڑی لگے گی نا؟"

"ہاں۔"

"اچھا، آج آپ کیا پکائیں گی۔"

"آج تو ہم پیزا منگوائیں گے اور میں دو فلمیں بھی لائی ہوں بچوں کی۔"

طوبیٰ کی آنکھوں میں شرارت کی وہ چمک لہرائی جو سفینہ کو بہت اچھی لگتی تھی۔ "اچھی ہونی چاہیے ممی...... تھرلنگ۔"

سفینہ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ بچی اس کو پریشانی سے بچانے کے لیے اپنا خوف چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

چھ بج کر دس منٹ پر وقاص آ گیا۔ طوبیٰ روتی ہوئی گئی اور اس کی بانہوں میں سما گئی "ڈیڈی، میں خطرے میں ہوں۔ آپ کو کیسا لگ رہا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"آپ دونوں باتیں کریں۔ میں کپڑے بدل لوں۔" سفینہ نے کہا۔

وقاص نے طوبیٰ کو ہٹا دیا۔ "دیر نہ لگانا سفینہ۔" اس نے کہا۔ "میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔"

سفینہ کو طوبیٰ کے چہرے پر دکھ نظر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وقاص کا گلا گھونٹ دے۔ اس نے اپنی آواز کو سختی سے بچاتے ہوئے کہا "بس ایک منٹ لگے گا۔"

اس نے جلدی سے کپڑے بدلے لیکن دس منٹ کمرے میں ہی موجود رہی

تاکہ طوبیٰ کو باپ سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ نکلنے ہی والی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ طوبیٰ نے پکارا۔

سفینہ نے جلدی سے دروازہ کھولا ''میں تیار ہوگئی۔ کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔ ڈیڈی نے کہا ہے کہ میں یہاں رہوں۔ وہ آپ سے اکیلے میں بات کریں گے۔''

''اوہ۔''

وقاص اسٹڈی میں کھڑا تھا۔ انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ پرسکون نہیں ہے۔ سفینہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ضرور کوئی ایسی بات کی ہے۔ طوبیٰ اپ سیٹ نظر آرہی تھی۔ ہوسکتا ہے' وہ اسے اپنی مصروفیت کے افسانے سناتا رہا ہو۔

سفینہ کے قدموں کی چاپ سن کر وقاص پلٹا ''سفینہ' مجھے ابھی آفس جانا ہے لیکن مجھے ایک اہم بات تمہیں بتانی ہے۔'' اس نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا ''تم نے فواد اصغر اور مبین چودھری کے قتل کے متعلق تو سن ہی لیا ہوگا۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''دیکھو سفینہ' امتیاز حیدر جو چاہتا ہے' معلوم کرلیتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو' اسے معلوم ہے کہ تم نے جیل جاکر مختار عظیم سے ملاقات کی تھی۔''

''تو اس سے اسے کیا فرق پڑتا ہے۔'' سفینہ نے بے نیازی سے کہا۔

''سفینہ' میرے ساتھ کھیل نہ کھیلو۔ میں بہت پریشان ہوں۔ امتیاز اس وقت گھرے ہوئے درندے کی طرح ہے۔'' اس نے کاغذ کا پرزہ سفینہ کی طرف بڑھا دیا۔ سفینہ نے اسے دیکھا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں جانم۔ تم جان جہان نہ بنو۔ ا ح!

''یہ کوئی معما ہے؟'' سفینہ نے پوچھا۔ پھر وقاص کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ سمجھ گئی۔ اس کی رگوں میں خون جیسے جمنے لگا۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟ اور اس کا کیا مطلب ہے؟''

''یہ مقتول مبین چودھری کی جیب سے نکلا ہے۔ تحریر فواد اصغر کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فواد اس کے زور پر استغاثہ سے اپنے لیے رعایت طلب کررہا تھا۔''

یعنی وہ نازنین کے قتل میں امتیاز کو ملوث کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ سفینہ نے بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کی ''یہ تو مجھے معلوم ہے کہ امتیاز کا نازنین سے میل جول تھا مگر تم پہلے یہ بتاؤ کہ طوبیٰ کے ساتھ وہ حرکت امتیاز کے کسی آدمی کی تھی اور وہ مجھے اس طرح دھمکی دے رہا تھا۔''

''میں تم سے صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ اس کیس میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ طوبیٰ کی خاطر' ایسا مت کرو۔''

''امتیاز کو معلوم ہے کہ تم اس وقت یہاں ہو؟''

''وہ جانتا ہے کہ طوبیٰ کی بہتری کی خاطر میں تمہیں روکنے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

''ایک منٹ۔'' سفینہ اپنے سابقہ شوہر کو بڑی بے یقینی سے دیکھ رہی تھی ''تم مجھ سے سیدھی بات کرو۔ تم یہاں مجھے تنبیہ کرنے آئے ہو کہ تمہارے بدمعاش موکل نے تمہارے ذریعے مجھے دھمکی بھجوائی ہے۔ خدا کی پناہ وقاص۔ تم نے خود کو کتنا گرالیا ہے۔ کتنے پست ہوگئے ہو تم۔''

''دیکھو۔ میں اپنی بچی کی جان بچانے کی کوشش کررہا ہوں۔''

''تمہاری بچی؟ اچانک وہ تمہارے لیے اتنی اہم ہوگئی۔ تمہیں پتا ہے' کتنی بار تم نے اسے مایوس کیا ہے' جب تم وعدہ کرکے اس سے ملنے نہیں آئے۔ بہت توہین آمیز رویہ ہے تمہارا۔ بس اب تم چلے جاؤ یہاں سے۔'' وقاص نے ہاتھ بڑھایا۔ سفینہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ''اور یہ کاغذ میرے پاس رہے گا۔''

''یہ مجھے دو۔'' وقاص نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کاغذ چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

''ڈیڈی' ممی کو چھوڑ دیں۔''

ان دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ طوبیٰ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چہرے کی خراشیں بہت سرخ اور تازہ لگ رہی تھیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سلمان اپنے آخری مریض سے نمٹ کر چار بج کر دس منٹ پر اپنے مطب سے نکلا تھا۔ اس کے جانے پر صالحہ وہاب نے سکون کی سانس لی۔ اب وہ

ڈاکٹر کی موجودگی میں کچھ پریشان رہنے لگی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر کے ہاتھ کا رعشہ بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن اس کی فکر کا سبب یہ نہیں تھا۔ بابرا ذیشان اور سفینہ انصار سے بات کرنے کے بعد اسے ڈاکٹر کی ذہنی حالت مشتبہ لگنے لگی تھی اور سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سلسلے میں کس سے بات کرے۔ ڈاکٹر سلمان بہت اچھا سرجن تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ بے عزتی کے ساتھ اس پیشے سے رخصت ہو۔

ساڑھے چار بجے بابرا نے فون کیا ''مس وہاب' رات ڈاکٹر نے مجھے فون کیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں رات کا کھانا اس کے ساتھ کھاؤں۔'' اس نے بتایا ''اور کھانے کے دوران میں وہ مجھے نازنین کہہ کر پکارتا رہا۔ میں اس کی شکرگزار ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ اس نے مجھے ڈرا دیا ہے۔ اس طرح تو میں نفسیاتی مریض بن جاؤں گی۔ میں راستہ چلتے ہوئے پلٹ کر دیکھتی رہتی ہوں۔ میں مزید یہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

صالحہ نے سمجھ لیا کہ اب وہ بابرا کو بہلا نہیں سکے گی۔ اب صرف سفینہ انصار سے مدد مل سکتی تھی۔ وہ نہ صرف وکیل تھی بلکہ اپنی بچی کے علاج کی وجہ سے ڈاکٹر کی احسان مند بھی تھی اور یہ بھی تھا کہ وہ ڈاکٹر کے بیک گراؤنڈ سے سب سے بڑھ کر واقف تھی۔ اور وہ ڈاکٹر سے ملاقات بھی کرنے والی تھی۔ چنانچہ صالحہ نے بابرا کو سفینہ کا نمبر دے دیا۔

☆☆☆

وقاص کے جانے کے بعد سفینہ اور طوبیٰ دیر تک صوفے پر خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر سفینہ نے بے حد محتاط لہجے میں کہا ''بیٹا' جو کچھ تم نے دیکھا' اسے بھول جاؤ۔ یہ یاد رکھو کہ ڈیڈی تم سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں تمہاری فکر ہے۔ انہوں نے خود کو جن مصیبتوں میں پھنسایا ہے' وہ اپنی جگہ لیکن تمہارے لیے جو ان کی محبت ہے' اس کی میں بہت قدر کرتی ہوں۔''

''لیکن جب انہوں نے کہا کہ انہیں میری فکر ہے تو آپ غصے سے بے حال ہو گئی تھیں۔'' طوبیٰ نے اعتراض کیا۔

''اسے چھوڑو۔ کبھی کبھی مجھے ان پر غصہ بہت آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان کی طرح نہیں ہو گی۔ وہ جان بوجھ کر خود کو مشکل میں پھنساتے ہیں اور پھر دوسروں سے اخلاقی مدد طلب کرتے ہیں کہتے ہیں...... ہاں یہ غلط ہے لیکن یہ ضروری ہے۔''

''ڈیڈی کو معلوم ہے کہ میری تصویر کس نے کھینچی ہے۔''

''ان کا خیال ہے کہ انہیں معلوم ہے۔ اس کا تعلق جعفر انکل کے ایک کیس سے ہے' جس میں وہ میری مدد چاہتے ہیں۔ جعفر ایک ایسے شخص کو جیل سے نکالنا چاہتے ہیں' جو ان کے خیال میں بے قصور ہے۔''

''آپ ان کی مدد کر رہی ہیں؟''

پہلے تو مجھے شبہ تھا کہ میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہی ہوں لیکن اب مجھے یقین ہے کہ جعفر کا مؤکل ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا ہے لیکن گڑیا' میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اسے بے قصور ثابت کرنے کی خاطر تمہیں خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔''

طوبیٰ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی ''لیکن ممی' یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ ایک بے قصور آدمی کو تو سزا نہیں ملنی چاہیے۔ آپ جس بات پر ڈیڈی کو برا کہہ رہی ہیں' وہی خود کر رہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ یہ بات غلط ہے لیکن یہ ضروری ہے۔''

''بیٹا!''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مما۔ بس اب آپ پیزا منگوا لیں۔''

سفینہ کو شاک لگا تھا۔ اس کی اتنی چھوٹی سی بیٹی اتنی بڑی بات کہہ رہی ہے۔ اتنی بڑی بات سمجھ سکتی ہے۔

طوبیٰ نے دونوں کیسٹ نکالے' ان کے نام پڑھے پھر اس نے ایک کیسٹ وی سی آر میں لگایا پھر اس نے سفینہ سے کہا ''ممی' مجھے یقین ہے کہ کار والا صرف مجھے ڈرا نہیں رہا تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ آپا مجھے لینے اسکول آ جایا کرے گی۔''

سفینہ اسے دیکھتی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا ''میری بیٹی' مجھے تم پر فخر ہے

اور خود پر شرم آ رہی ہے۔'' اس نے طوبیٰ کو لپٹا لیا۔

''تم فلم دیکھو میں فون کر کے پیزا منگواتی ہوں۔''

قریب کے ریسٹورنٹ سے پیزا آ گیا مگر اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف بابرا ذیشان تھی۔ اس نے اپنا تعارف کرانے کے بعد معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ''میں آپ کو زحمت دے رہی ہوں لیکن صالحہ وہاب کا کہنا ہے کہ مجھے آپ سے مدد مل سکتی ہے۔''

سفینہ نے کاغذ اور قلم سنبھالا اور نوٹ کرتی رہی۔ بابرا نے سرجری کے لیے ڈاکٹر سلمان سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک تصویر دکھا کر پوچھا۔ تم ایسی بننا چاہتی ہو۔ پھر ڈاکٹر نے سرجری کی' اسے وہ تصویر والا چہرہ دیا اور اب وہ اسے نازنین کے نام سے پکارتا...... اس کا تعاقب کرتا ہے۔

''میں ڈاکٹر سلمان کی شکر گزار ہوں۔ انہوں نے میر زندگی بدل دی۔'' آخر میں بابرا نے کہا ''میں پولیس کو رپورٹ کر کے انہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتی لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی میں برداشت نہیں کر سکتی۔''

''آپ کو ڈاکٹر سے جسمانی طور سے خطرہ محسوس ہوا ہے؟''

چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد بابرا نے کہا ''ایسی بات تو نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی دست درازی نہیں کی لیکن کبھی کبھی مجھے اس میں دبی ہوئی برہمی نظر آتی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ کبھی بھی کسی پر بھی غصہ اتار سکتے ہیں...... مجھ پر بھی۔''

''دیکھیں بابرا! مجھے پیر کے دن ڈاکٹر سے ملاقات کرنی ہے۔ ڈاکٹر کو اس بات کی خبر نہیں۔ اب میں نے تم سے جو سنا ہے تو اس سے لگتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ میں اسے رضامند کرنے کی کوشش کروں گی کہ وہ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرے لیکن اگر تم خوف زدہ ہو تو میرا مشورہ ہے کہ تمہیں پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیے۔''

''ابھی نہیں۔ مجھے اگلے ہفتے بزنس کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا ہے۔ واپسی پر میں اس سلسلے میں فیصلہ کروں گی۔''

☆☆☆

ریسیور رکھنے کے بعد سفینہ کچن میں ہی بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صورت حال پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر سلمان' بابرا کا پیچھا کرتا رہا ہے تو کیا وہ اپنی بیٹی کا بھی پیچھا کرتا تھا۔ یہی بات ہے ورنہ قتل کی رات فاطمہ نے اور اس بچے نے اس کی سیاہ فاکسی مختار کے گھر کے باہر نہ دیکھی ہوتی۔ یونس کو ڈاکٹر کی کار کا نمبر معلوم کر کے فاطمہ سے چیک کرنا چاہیے۔

اور بابرا نے ایک خطرے کا اظہار کیا تھا۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر نے اپنے اندر بھرا ہوا غصہ نازنین پر اتار دیا ہو مگر امتیاز حیدر اس بات سے کیوں خوف زدہ ہے کہ اس کا نام اس کیس میں لیا جائے گا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ڈاکٹر سے ملاقات سے پہلے ڈاکٹر کے نازنین سے تعلقات کے بارے میں سمجھنا ہو گا اور اس نوادرات کے ایکسپرٹ ارشد جمال سے بات کرنی چاہیے۔ وہ نازنین کو شاپنگ کے لیے لے جاتا رہا ہے۔ کیا پتا' انہیں کبھی ڈاکٹر بھی کہیں ملا ہو۔

اس نے ارشد کو فون کیا اور مشین پر پیغام چھوڑا کہ وہ اسے جوابی کال کرے پھر وہ جعفر کو فون کرنے کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ مختار عظیم سے ایک اور ملاقات کرنا چاہتی تھی لیکن اس بار وہ بتول سے اس کی ماں سے بھی ملنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

ارشد جمال اس روز آرام کرنا چاہتا تھا لیکن آمنہ بیگم نے اسے کنٹری کلب میں مدعو کیا تو اس نے بخوشی یہ دعوت قبول کر لی۔ آمنہ بیگم بہت مال دار عورت تھی۔ وہ کلب میں پہنچا تو پتا چلا کہ آمنہ اور اس کا شوہر یوسف ابھی کلب پہنچے ہیں۔ وہ تینوں ہال کی طرف جا رہے تھے کہ ایک رخصت ہوتے ہوئے جوڑے سے سلام دعا کے لئے رک گئے۔ وہ شاہ زیب اکبر اور اس کی بیوی تمکنت اکبر تھے۔ ارشد شاہ زیب سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

تمکنت وہیل چیئر پر تھی لیکن بہت پر وقار لگ رہی تھی۔ ارشد نے اسے دیکھ کر سوچا کہ یہ عورت اپنی جوانی اور صحت کے دنوں میں بہت حسین رہی ہو گی۔

آمنہ بیگم نے تمکنت اور شاہ زیب سے ارشد کا تعارف کرایا پھر اس دہرے

قتل کے متعلق بات ہونے لگی جو اس دن کا گرم موضوع تھا۔

"مجھے تو یہ بدمعاشوں کی کارروائی لگتی ہے۔" یوسف نے کہا۔

پچھلے آٹھ سالوں میں میسز صاحب نے مجرموں کے خلاف بہت کام کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اظہر عباس اس کام کو اور آگے بڑھائے گا۔"

"تم نے موقع ملتے ہی کنویسنگ شروع کر دی۔" حکمت نے اسے چھیڑا۔

"اچھا بھئی سوری۔" شاہ زیب نے کہا پھر وہ ارشد کی طرف مڑا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مسٹر جمال۔"

"ہم پہلے کہیں ملیں ہیں؟" حکمت نے ارشد سے پوچھا "مجھے لگتا ہے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔"

ارشد کے اندر چھٹی حس کا خود کار الارم چیخا "میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے اس عورت دیکھا ہوتا تو بھولتا نہیں۔

"پتا نہیں مگر مجھے لگتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ چلے گئے لیکن اب ارشد خوش نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش یہاں نہ آیا ہوتا۔

ساڑھے دس بجے وہ گھر پہنچا تو ریکارڈنگ مشین پر سفینہ انصار کا پیغام ملا۔ وہ اسسٹنٹ پروسیکیوٹر تھی۔ اس نے کہا تھا کہ گیارہ بجے رات تک یا پھر اگلی صبح اسے ضرور فون کرے۔ اس نے وضاحت کی تھی کہ وہ اس کی پرانی دوست نازنین مختار کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہے اور یہ غیر سرکاری ہو گا۔

☆☆☆

جمعے کی شام جعفر لیاقت نگر اپنے آبائی گاؤں چلا گیا۔ دھام پور سے اس کی بہن بہنوئی اپنے دو سالہ جڑواں بچوں کے ساتھ ملنے آئے ہوئے تھے۔

وہ ستائیس سال پرانا مکان تھا۔ اس عرصے میں اس کی قیمت دس گنا بڑھ گئی تھی۔ اس روز وہاں اس خاندان کی تین نسلیں جمع تھیں۔ جعفر کی دوسری بہنیں جو اسی شہر میں رہتی تھیں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ انہیں امی نے مدعو کر لیا تھا۔ یوں سب لوگ جمع تھے۔

سب سے مل ملا کے تھوڑی سی باتیں کر کے جعفر اپنے والد کے ساتھ ان کی اسٹڈی میں چلا گیا۔ سعید صاحب خود بھی وکیل تھے مگر اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ سعید صاحب نے بیٹے سے زہرے قتل کے بارے میں دلچسپی سے سوالات کیے۔ وہ ان کی معلومات حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔

"میں زیادہ کچھ نہیں جانتا ابو لیکن یہ ڈاکوؤں والی بات کسی کے بھی حلق سے نہیں اتر رہی ہے۔" جعفر نے کہا "سب جانتے ہیں کہ فواد اصغر امتیاز کے خلاف گواہی دینے والا ہے۔"

اس وقت بچے کمرے میں گھس آئے "نانا...... ماموں کھانا لگ گیا ہے۔ چلئے نانی بلا رہی ہیں۔"

"آپ چلیں ابو۔ میں ٹیلی فون کے پیغامات چیک کر کے آتا ہوں۔"

اس نے مشین پر سفینہ کی آواز سنی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ کیا واقعی وہ مختار سے دوبارہ ملنا چاہتی ہے اور وہ بتول اور صدیقہ بیگم سے بھی ملنا چاہتی ہے۔

وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ بھرا ہوا گھر دیکھ کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ امی بھی بہت خوش تھیں "بس اب ایک بہو لے آؤں تو سکون آ جائے۔" وہ کہہ رہی تھیں پھر ان کی نظر جعفر پر پڑی تو انہوں نے منہ بنا لیا "لیکن آج کل کے لڑکوں کو ماں باپ کی خوشی کی پروا ہی نہیں ہے۔"

جعفر مسکرانے لگا "جعفر بھائی تلاش میں تو ہوں گے امی۔" اس کے چھوٹے بہنوئی نے کہا۔

کھانے کے بعد جعفر نے سفینہ کو فون کیا۔ سفینہ اس کی آواز سن کر خوش ہوئی "سفینہ کل مختار کے پاس چلو گی۔ میں بتول اور صدیقہ بیگم کو بھی بلا لوں گا۔ وہ سارے کام چھوڑ دیں گی اس کے لیے۔"

"میں چاہتی تو ہوں لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ میں طوبیٰ کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اور طوبیٰ کو یہاں لے آؤں گا۔ یہاں میرے

بھانجے اور بھانجیاں آئے ہوئے ہیں۔ طوبیٰ یہاں خوش بھی رہے گی اور محفوظ بھی۔"

"ٹھیک ہے جعفر شکریہ۔"

☆☆☆

ہفتہ۔ 4 نومبر!

اس رات ارشد جمال ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔ وہ الجھن میں تھا کہ اسسٹنٹ پروسیکیوٹر سفینہ انصار کے سلسلے میں کیا کرے۔ سات بجے تک اس نے فیصلہ کرلیا کہ سفینہ کو فون کر کے بتا دے گا کہ وہ اس سے ملاقات کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ ملاقات طویل نہ ہو۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ کچھ عرصہ وہ شام نگر والے مکان میں پ کرگزارے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اسے نیند آگئی۔

صبح ساڑھے سات بجے وہ سو کر اٹھا تو سب سے پہلے اس نے سفینہ کو فون کیا۔ سفینہ کے لہجے میں شکرگزاری نے اسے اعتماد بخشا "میں آپ کی شکرگزار ہوں ارشد صاحب۔ اصل میں میں آپ سے مقتولہ نازنین اور اس کے باپ ڈاکٹر سلمان کے متعلق بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔"

ارشد لہجے کو پہچانتا تھا اور سفینہ کے لہجے میں سچائی تھی۔ معاملہ نازنین کا تھا اور نازنین سے اس کا تعلق رہا تھا لیکن پریشانی کی بات نہیں تھی۔ نازنین سے تعلق تو بہت لوگوں کا رہا ہے۔ بہرحال سفینہ نے ایک گھنٹے میں اس کے گھر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔

☆☆☆

سفینہ نے فیصلہ کیا کہ ارشد کے گھر جاتے ہوئے طوبیٰ کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ رات کو اس کے اور وقاص کے درمیان جو چھینا جھپٹی ہوئی تھی' اس سے بچی پر برا اثر پڑا ہوگا۔ اب اس آدھے گھنٹے کی ڈرائیو میں وہ اس سے باتیں کر کے اس کے اثرات کو کم کرسکے گی۔ اسے احساس تھا کہ رات وہ غلطی پر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقاص کاغذ کا وہ ٹکڑا اسے ہرگز نہیں رکھنے دے گا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ کاغذ پر جو کچھ بھی لکھا تھا' وہ اس کو یاد تھا اور اس نے کاغذ پر لکھ بھی لیا تھا کہ جعفر کو دکھا سکے۔

اس نے طوبیٰ کو یہ بھی بتایا کہ وہ اسے جعفر کے ابا اور امی کے پاس لے کر چلے گی "آپ میری طرف سے پریشان ہیں نا؟" طوبیٰ نے یہ سن کر کہا۔

"ہاں اور مجھے اطمینان ہے کہ وہاں تم محفوظ رہو گی۔" سفینہ نے کہا۔

ذرا دیر بعد وہ ارشد جمال سے ملنے کے لیے نکل کھڑی ہوئی "گڑیا' میں تمہارے لیے کہانیوں کی کتاب ساتھ لائی ہوں۔" ڈرائیو کے دوران اس نے بچی سے کہا "میں ارشد جمال سے تنہائی میں بات کروں گی۔"

"ٹھیک ہے ممی۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ آج جعفر انکل کے کتنے بھانجے اور بھانجیاں موجود ہوں گے۔ دیکھیں' انکل کی چار بہنیں ہیں سب سے چھوٹی کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ سب سے بڑی بہن کے چار بچے ہیں۔ ان میں ایک لڑکا ہے نو سال کا۔ ایک لڑکی سات سال کی اور ایک لڑکا چار سال کا ہے۔ دوسری بہن کے چار بچے ہیں اور تیسری کے جڑواں بیٹے ہیں وہ دو سال کے۔"

"ارے طوبیٰ' تمہیں یہ سب کہاں سے پتا چلا؟" سفینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جعفر انکل مجھے ان کے بارے میں بتاتے رہے ہیں۔ آپ دھیان سے سن ہی نہیں رہی تھیں۔ سچ ممی' وہاں بہت مزہ آئے گا۔"

مزید پانچ منٹ کے بعد وہ ارشد جمال کے گھر پہنچ گئے۔ طوبیٰ کو اس کا گھر بہت پسند آیا۔ ارشد نے بڑی خوش دلی سے ان کا خیر مقدم کیا "مس انصار' یہ آپ کی اسسٹنٹ ہے؟"

"یہ میری بچی ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ ملاقات غیر سرکاری ہے۔ طوبیٰ کو ہم کہیں بھی بٹھا دیں گے۔"

"ان کے لیے اسٹڈی مناسب رہے گی اور ہم لائبریری میں بیٹھیں گے۔"

سفینہ کو اس کا گھر دیکھ کر میوزیم کا خیال آرہا تھا۔ وہاں نوادرات کی کثرت تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ان چیزوں کا جائزہ لیتی۔ بہرحال اس نے بات شروع کی "ارشد صاحب' ایک حادثے میں میری بچی کے چہرے پر خراشیں لگی تھیں۔ گہری خراشیں تھیں۔ ڈاکٹر سلمان نے سرجری کی۔"

"نازنین کے والد؟"

"ہاں، وہی دو وزٹ کے دوران میں نے دو مختلف عورتیں دیکھیں۔ وہ دونوں اس کی مقتول بیٹی نازنین کی ہم شکل تھیں۔"

"اتفاق ہوگا۔" ارشد نے اسے بہت غور سے دیکھا "وہ دانستہ تو ایسا نہیں کر سکتے۔"

"بہر حال میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ میں نازنین کو بہتر طور پر سمجھنا چاہتی ہوں۔ اس کے شوہر اور باپ سے تعلقات کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

ارشد نے چھت کی طرف دیکھا اور گہری سانس لی "یہ اب سے تقریباً بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ میں پہلی بار نازنین سے ملا۔ وہ میرے گھر آئی تھی اور یقین کریں کہ وہ غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ ابھی حال ہی میں اس کا نیا مکان مکمل ہوا ہے اور وہ اسے سجانا چاہتی ہے اور یہ کہ اسے نوادرات کا بہت شوق ہے۔ اس نے میرے متعلق سنا تھا اور وہ اسی لیے آئی تھی۔"

یوں آپ اس کے مشیر برائے نوادرات بن گئے؟"

"جی ہاں بلکہ ہم اچھے دوست بن گئے۔ میں تو اس کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ میرے ہاں کی دعوتوں میں وہ رنگ بھر دیتی تھی۔"

"مختار بھی اس کے ساتھ آتا تھا؟"

"کبھی کبھی، وہ خشک مزاج آدمی تھا۔ میرے بیشتر مہمان اس سے اجنبیت محسوس کرتے تھے۔ اس کا غلط مطلب نہ لیں۔ وہ بہت ذہین اور خوش اطوار تھا لیکن پارٹی کے شرکا سے مختلف تھا۔ وہ محنتی اور اولوالعزم تھا۔ بے کار باتوں میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

"نازنین اور مختار کے تعلقات کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔"

"پہلے تو لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں، لیکن پھر ایسا لگا کہ نازنین اس سے بور ہوگئی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے دور رہنے لگے تھے۔"

ڈاکٹر سلمان نے حلفیہ بیان میں کہا کہ مختار نازنین پر شک کرتا تھا اور اسے دھمکیاں دیتا رہا تھا۔"

"مجھے نازنین نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔"

"آپ ڈاکٹر سلمان کو جانتے ہیں؟"

"تھوڑا بہت۔ میں نازنین کے ساتھ ہی ڈاکٹر سے ملا ہوں۔ نازنین ڈاکٹر کی مسلسل توجہ سے بیزار رہتی تھی۔ وہ اس سے بدتمیزی بھی کر بیٹھتی تھی۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ اپنی ماں اور سوتیلے باپ کے پاس پلی بڑھی تھی۔"

"جی ہاں اور وہ اسے بہت اذیت ناک عرصہ قرار دیتی تھی۔ اس کی سوتیلی بہنیں اس کی خوب صورتی سے جلتی تھیں۔"

یعنی نازنین نے سچ نہیں بتایا۔ یہ نہیں بتایا کہ ابتدا میں وہ بد صورت تھی۔ "آپ کو علم ہے کہ نازنین کے کسی مرد کے ساتھ تعلقات تھے۔ خاص طور پر امتیاز حیدر سے۔"

ارشد نے جواب دینے سے پہلے سوچا پھر بولا "نازنین کو پہلی بار امتیاز سے میں نے ہی متعارف کرایا تھا۔ یہیں، اسی کمرے میں۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہوگئے۔ آپ جانتی ہیں کہ امتیاز کے پاس طاقت ہے اور طاقت میں نازنین کے لیے بہت کشش تھی۔ نازنین کنٹری کلب میں بہت وقت گزارتی تھی۔ اس سے ملنے کے بعد امتیاز بھی وہاں کثرت سے جانے لگا۔ ممبر تو خیر وہ پہلے ہی سے تھا۔"

"نازنین اس بات سے خوش تھی؟"

"بہت، بہت زیادہ لیکن اس نے امتیاز پر یہ بات کبھی کھلنے نہیں دی۔ وہ اسے رقابت میں مبتلا کر کے خوش ہوتی تھی اور اس کے مواقع اسے بکثرت ملتے تھے اس لیے وہ عورتوں میں بہت غیر مقبول تھی۔"

"اس پر ڈاکٹر سلمان کا کیا ردعمل تھا؟"

"اسے بہت غصہ آتا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اسے سب کی نظروں سے چھپالیتا۔"

"تو پھر وہ مختار عظیم سے بھی چڑتا ہوگا۔"

"میرے خیال میں بات اس سے بھی گہری ہے۔" ارشد نے گہری سانس لے کر کہا "وہ مختار سے نفرت کرتا تھا۔"

"اچھا یہ بتائیں۔ نازنین کو اور مردوں سے بھی زیورات ملتے تھے؟"

"کیا پتا' مجھے تو معلوم نہیں ویسے اس کے پاس چند حسین زیور تھے۔ مختار کے دیے ہوئے اور شاید ڈاکٹر سلمان کے دیے ہوئے بھی۔"

سفینہ اٹھ کھڑی ہوئی "ارشد صاحب' کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مختار عظیم نے نازنین کو قتل کیا ہوگا؟"

ارشد بھی کھڑا ہو گیا۔ "مس انصار' مجھے نوادرات کی بڑی سوجھ بوجھ ہے لیکن انسانوں کے معاملے میں' میں ماہر نہیں ہوں۔ کہتے ہیں کہ محبت اور دولت قتل کے لیے اکسانے والے دو بڑے محرکات ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ مختار کے پاس یہ دونوں محرکات تھے۔"

☆☆☆

ارشد جمال لائبریری کی کھڑکی سے سفینہ کی کار کو جاتے دیکھتا رہا۔ اب وہ اس مختصر انٹرویو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بہت اچھی حکمت عملی اپنائی تھی۔ سفینہ کا تاثر یہ ہوگا کہ اس نے اس کے ساتھ تعاون کیا ہے لیکن اصل میں اس نے کام کی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ یہ ٹیکنیک وہ برسوں پہلے مقدمے کے دوران بھی استعمال کر چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں استغاثہ اور صفائی دونوں نے یہی سوچا تھا کہ اس سے مزید گفتگو بے سود ہے۔ اب یہ سفینہ بھی آخر میں یہی فیصلہ کرے گی۔

سفینہ نے اس کا خیال پوچھا تھا۔ سچا جواب تو یہ تھا کہ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ مختار نے نازنین کو قتل کیا تھا۔ ہاں اوروں کی طرح وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ مختار اپنی بیوی کو قتل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس معاملے میں کوئی اور مختار عظیم سے سبقت لے گیا تھا۔

☆☆☆

مختار عظیم اپنی زندگی کا سب سے سخت وقت گزار رہا تھا۔ جب سے جعفر نے اسے بتایا تھا کہ اسسٹنٹ پروسیکیوٹر سفینہ انصار نے اس کے کیس سے ہاتھ اٹھا لیا ہے'

تب سے کوئی اس کے کانوں میں مسلسل چیختا جا رہا تھا...... عمر قید...... عمر قید اور وہ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا تھا۔ اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔

وہ بتول کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب بتول کو ملنے کے لیے آنے سے منع کر دے گا۔ بتول کو اپنی زندگی کی فکر کرنی چاہیے۔ اب وہ 39 سال کی ہے۔ اچھا یہ ہے کہ وہ کم عمر لگتی ہے۔ اب وہ شادی کر لے' اس کے بچے ہوں اور وہ اچھی طرح زندگی گزارے۔ وہ تو ہمیشہ سے بچوں سے محبت کرنے والی رہی ہے اور اس نے ایک اور فیصلہ بھی کیا تھا۔ اب وہ مکانوں کے نقشے نہ سوچے گا نہ بنائے گا اس لیے کہ اب وہ کبھی کوئی عمارت تعمیر نہیں کر سکتا۔ عمر قید کاٹنے کے بعد وہ جیل سے نکلا بھی تو اس میں اتنی طاقت نہیں ہوگی۔

یہی وجہ تھی کہ ہفتے کی صبح جعفر نے اسے فون پر بتایا کہ سفینہ انصار' بتول اور اس کی ماں اس سے ملنے آ رہی ہیں تو بہت برہم ہوا "اب یہ سفینہ انصار کیا چاہتی ہے۔" اس نے غصے سے کہا "میری ماں کو اور بتول کو یہ دکھانا کہ وہ خواہ مخواہ میرے لیے وقت برباد کر رہی ہے۔"

"شٹ اپ مختار۔" جعفر نے اسے ڈپٹ دیا "تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے کیس کی وجہ سے سفینہ کتنا نقصان برداشت کر رہی ہے۔ اس کی آٹھ سالہ بیٹی کو ہدف بنا کر اسے دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ وہ اس کیس سے ہاتھ اٹھا لے۔"

یہ سن کر مختار بھونچکا رہ گیا "دھمکی...... کیسی دھمکی۔ کون دے رہا ہے دھمکی؟" وہ حیران تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟

"ہمیں یقین ہے کہ دھمکی امتیاز حیدر کی طرف سے ہے۔ وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی لیکن بہر حال امتیاز نہیں چاہتا کہ اس کیس میں اس کا نام آئے۔ سنو مختار' سفینہ اب تم سے تفصیلی بات کرنا چاہتی ہے نہ صرف تم سے' بلکہ بتول اور تمہاری ماں سے بھی۔ یہ ہمارے لیے بہترین موقع ہے اور شاید آخری بھی۔"

مختار نے رابطہ ٹوٹنے کی آواز سنی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ امید کی جو کرن اس نے بجھا دی تھی' وہ اسے پھر جگمگاتی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

جعفر نے سفینہ اور طوبیٰ کو ایک بجے پک کیا۔ وہ لیاقت نگر پہنچے۔ جعفر نے انہیں سب سے متعارف کرایا۔ رات کو کھانے کے بعد اس نے سب لوگوں کو ان کے متعلق بتا دیا تھا لیکن ماؤں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے اس کی امی نے محسوس کر لیا تھا کہ طوبیٰ کی ممی ان کے بیٹے کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔

سو اب اس کی امی سفینہ کو تولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ جعفر کو ان کی نگاہوں میں سفینہ کے لیے ستائش نظر آئی۔ وہ لگ بھی بہت اچھی رہی تھی۔

طوبیٰ وہاں نو عدد بچوں کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ دو سالہ جڑواں بچے اس کے لیے عجوبے کی حیثیت رکھتے تھے اور سب سے بڑھ کر اس کی توجہ کا مرکز تھے وہ ایک دوسرے سے اتنے مشابہ تھے کہ انہیں الگ الگ شناخت کرنا ممکن نہیں تھا" ممی! آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں یہاں بہت خوش رہوں گی۔" اس نے سفینہ کو کہا۔

سفینہ باہر آئی۔ جعفر کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے گہری سانس لی۔

"تم پریشان تو نہیں ہو؟" جعفر نے اس سے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ میں تو پر سکون ہو گئی ہوں۔ اچھا اب میں تمہیں وہ کچھ بتاؤں گی جو اب تک تمہیں معلوم نہیں ہے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہی کہ نازنین کیسے پلی بڑھی۔ وہ کیسی تھی اور یہ کہ ڈاکٹر کا رویہ اپنی ایک مریضہ کے ساتھ کیسا ہے' جسے اس نے نازنین کا چہرہ دیا تھا اور میں تمہیں وہ سب بھی بتاؤں گی جو آج ارشد جمال سے معلوم ہوا ہے۔"

☆☆☆

وہ دونوں جیل پہنچے تو بتول اور صدیقہ بیگم وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ ملاقات کے انتظار کے دوران میں سفینہ بتول سے باتیں کرتی رہی' وہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔

ٹھیک تین بجے انہیں مختار عظیم سے ملوایا گیا۔ اس روز پچھلی بار کے برعکس ملاقاتیوں کا بہت ہجوم تھا۔ تقریباً ہر قیدی کی ملاقات آئی ہوئی تھی۔ صدیقہ بیگم نے اپنے بیٹے کو محبت سے لپٹا لیا۔ بتول حجاب میں لپٹی ہوئی پیچھے کھڑی تھی۔ لیکن مختار اور بتول نے ایک دوسرے کو جن نظروں سے دیکھا' اس سے سفینہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے درمیان کتنی گہری محبت ہے۔

مختار کو دیکھتے ہوئے سفینہ کے ذہن میں اس دن کی یاد تازہ ہو گئی جب مختار کو تیس سال کی سزا سنائی گئی تھی۔ سزا کے بعد اس کے چہرے پر دکھ اور اذیت کا وہ گہرا تاثر اور پھر اس کے الفاظ جس میں اس نے قسم کھا کر ڈاکٹر سلمان کو جھوٹا قرار دیا تھا' وہ سب اسے یاد تھا اور اسے یاد آیا کہ اس وقت بھی اسے مختار کی آواز اور لہجے میں سچائی کی گونج محسوس ہوئی تھی۔

سفینہ کے ہاتھ میں رائٹنگ پیڈ تھا۔ اس کے ذہن میں جو سوالات اٹھے تھے' وہ اس نے ایک صفحے پر نوٹ کر لیے تھے۔ اس نے مختصر الفاظ میں ان لوگوں کو وہ سب کچھ سنا دیا' جس کی وجہ سے وہ مختار سے دوبارہ ملاقات پر مجبور ہوئی تھی۔ فاطمہ کا یہ کہنا کہ قتل کی رات اس نے مختار کے گھر کے باہر ایک سیاہ فاکس ویگن دیکھی تھی۔ یہ حقیقت کہ نازنین ایک بے رنگ لڑکی تھی اور ڈاکٹر کا اپنی ایک سے زائد مریضاؤں کو نازنین کا ہم شکل بنانا پھر ایسی ہی ایک مریضہ بابرا پر ڈاکٹر کا مریضانہ التفات۔ یہ حقیقت کہ نازنین کے قتل کے کیس میں امتیاز حیدر سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی اور آخر میں طوبیٰ کے لیے دھمکی۔

سفینہ ان تینوں کو اس بات کا کریڈٹ دیے بغیر نہ رہ سکی کہ ان سنسنی خیز انکشافات پر ابتدائی شاک کے علاوہ انہوں نے گفتگو کر کے وقت ضائع نہیں کیا۔ بتول نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں مختار کا ہاتھ پکڑا اور سفینہ سے پوچھا "تو اب ہم کچھ کر سکتے ہیں؟"

''سب سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ اب مجھے مختار صاحب کے مجرم ہونے پر شک ہے اور عدالت کے فیصلے پر نظر ثانی کی کوشش میں جعفر کی پوری مدد کروں گی۔ پچھلے ہفتے مختار صاحب نے جو اندازہ لگایا تھا کہ مجھے ان کی بے گناہی پر یقین نہیں ہے' وہ مکمل طور پر درست نہیں تھا۔ میں صرف اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ نظر ثانی کی اپیل کے لیے ہمارے پاس کوئی مواد' کوئی موثر جواز نہیں ہے۔ سزا ڈاکٹر سلمان کی گواہی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی جس سے ثابت ہوتا کہ ڈاکٹر کے پاس عدالت میں جھوٹ بولنے کا کوئی جواز تھا مگر اب صورت حال مختلف ہے۔ میں ڈاکٹر سلمان ہی کو گھیروں گی کیونکہ اس کے کئی جھوٹ سامنے آ چکے ہیں۔''

اس کے بعد باقی وقت سفینہ ان لوگوں سے مختلف سوالات کرتی رہی۔ ''مختار کیا کبھی نازنین نے آپ کے سامنے امتیاز حیدر کا تذکرہ کیا؟''

''کبھی کبھی...... سرسری انداز میں۔'' مختار نے کہا ''میں جانتا تھا کہ امتیاز کنٹری کلب کا ممبر ہے۔''

''یہ امتیاز ہی ہے نا جس پر آج کل ٹیکس کے ہیر پھیر کا مقدمہ چل رہا ہے۔'' صدیقہ بیگم نے پوچھا۔

سفینہ نے سر کے اشارے سے انہیں اثبات میں جواب دیا۔ پھر وہ مختار کی طرف متوجہ ہوئی ''مجھے ان زیورات کے متعلق بتایئے جو آپ کے خیال میں نازنین کو کسی اور مرد نے دیے تھے۔''

''ان میں ایک سونے کا بریسلیٹ تھا' جس پر برج جدی کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے یہ بھی بتا دوں کہ نازنین کا تعلق برج جدی سے تھا۔ وہ بہت بیش قیمت تھا۔ نازنین کا کہنا تھا کہ وہ اسے اس کے پاپا نے دیا تھا۔ لیکن جب میں نے اس پر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔''

''یہ ایسی چیز ہے جسے ہم ٹریس کر سکتے ہیں۔'' سفینہ نے کہا' 'بڑے جیولرز سے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔''

''اور ایک زمرد اور ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ دل کی شکل میں۔''

''اور نازنین کا کہنا تھا کہ وہ بھی اس کے باپ نے اسے دی ہے؟''

''ہاں' وہ کہتی تھی کہ کیونکہ وہ بچپن اور لڑکپن میں ڈاکٹر سے دور رہی ہے لہذا اب ڈاکٹر اس کی تلافی کر رہا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق کچھ خاندانی زیورات تھے۔ اس کی ماں کے اور یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ہاں' اس کے پاس ایک پن تھی پھول کی شکل کی۔ وہ بہت پرانی تھی۔''

''وہ تو مجھے بھی یاد ہے۔'' صدیقہ بیگم نے جلدی سے کہا' 'اس سے چاندی کی ایک زنجیر بھی منسلک تھی۔ اس کی ایک تصویر بھی میرے پاس ہے جو اخبار میں چھپی تھی۔ وہ میں نے کاٹ کر رکھ لی تھی۔ ایک اور ڈائمنڈ کا بریسلیٹ تھا۔ وہ موت کے وقت پہنے ہوئے تھی۔ کیوں مختار؟''

''قتل کی رات نازنین کے زیورات کہاں تھے؟'' سفینہ نے پوچھا۔

''ڈریسنگ ٹیبل کی اوپری دراز میں۔ جیولری کیس میں۔'' مختار نے جواب دیا ''اور کچھ پہنے ہوئے بھی تھی۔''

''اور آپ نے عدالت میں کہا تھا کہ کچھ چیزیں غائب بھی تھیں۔'' سفینہ بولی۔

''دو چیزوں کے بارے میں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔'' مختار نے پر جوش لہجے میں کہا' 'ایک پھول والی پن اور دوسرا نوادرات والا جڑاؤ فریم' جو ہمیشہ نائٹ ٹیبل پر رکھا رہتا تھا۔''

''مجھے ذرا تفصیل سے بتائیں۔''

''میں بتاتی ہوں مختار۔'' صدیقہ بیگم نے مداخلت کی۔ ''سنو سفینہ۔ وہ فریم بہت خوب صورت تھا۔ وہ بیضوی شکل کا تھا اس پر سونے کا بارڈر تھا۔ اس کا رنگ نیلا تھا اور اس میں سچے موتی جڑے ہوئے تھے۔ وہ میرے شوہر جرمنی سے لائے تھے میرے لیے۔ میں نے وہ مختار اور نازنین کو شادی میں تحفے کے طور پر دیا تھا۔''

''اس میں نازنین نے اپنی ایک تصویر لگائی تھی۔'' مختار نے بتایا۔

''آپ نے آخری بار اس فریم کو کب دیکھا تھا؟'' سفینہ نے مختار سے پوچھا۔

"قتل والے روز صبح میں کپڑے بدل رہا تھا تو میں نے اسے دیکھا تھا۔ اور اس رات جب پولیس مجھے پوچھ گچھ کے لیے اسٹیشن لے جا رہی تھی۔ پولیس والے مجھے شناختی کارڈ کے لیے بیڈ روم میں لائے۔ اس وقت میری نظر نائٹ ٹیبل پر پڑی تو وہ فریم موجود نہیں تھا۔"

"اگر نازنین کے کسی اور کے ساتھ تعلقات تھے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے وہ تصویر اس شخص کو دے دی ہو۔"

"نہیں' اسے اپنی وہ تصویر بہت پسند تھی۔ اسے دیکھتے رہنا' اسے اچھا لگتا تھا اور اس کے علاوہ میں نہیں سمجھتا کہ میری ماں کے تحفے کو وہ کسی اور کو دینے کی جرات کر سکتی تھی۔"

"اور وہ فریم اس کے بعد کبھی نظر نہیں آیا؟"

"کبھی نہیں اور میں نے جب بھی اس کی چوری کا تذکرہ کیا تو پروسیکیوٹر نے دلیل دی کہ اگر کوئی چور آیا تھا تو تمام جیولری غائب ہونی چاہیے تھی۔"

اسی وقت گھنٹی بجی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ مختار جانے کے لیے اٹھا۔ وہ سفینہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "خاتون آپ مجھے یہاں سے نکلوا دیں تو میں آپ کے لیے ایسا خوبصورت مکان تعمیر کروں گا' جسے آپ زندگی بھر چھوڑنا نہیں چاہیں گی۔" پھر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا' "مجھے خود بھی یقین نہیں آتا کہ جیل میں بند ہوتے ہوئے میں نے ایسی بات کہی ہے۔"

اس وقت کمرے میں وحید نواز نامی قیدی اپنی بیوی سے ملاقات کر رہا تھا لیکن اس کی توجہ اپنی بیوی سے زیادہ مختار والے گروپ پر تھی۔ اسے یاد تھا کہ سفینہ انصار پچھلے ہفتے بھی مختار سے ملاقات کے لیے آئی تھی۔ سفینہ کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے اس وقت وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے مقدمے میں سفینہ ہی پروسیکیوٹر تھی۔

اس نے اپنی بیوی کو رخصت ہوتے ہوئے سرگوشی میں کہا' "اپنے بھائی سے کہہ دینا کہ یہ بات آگے بڑھا دے۔ سفینہ انصار آج بھی مختار سے ملنے آئی تھی اور مسلسل نوٹس لے رہی تھی۔"

☆☆☆

محکمہ سراغ رسانی کا انسپکٹر محسن نقب زنی کے کیس پر کام کر رہا تھا۔ ہفتے کی سہ پہر وہ اپنے آفس میں بیٹھا کمپیوٹر سے نکالے ہوئے پرنٹ کا جائزہ لے رہا تھا' اس نے ان تمام لوگوں سے ملاقات کی تھی جن کے گھروں میں ایک ہی انداز کی وارداتیں ہوئی تھیں۔ ہر واردات میں الارم بے کار کر دیے گئے تھے۔ اس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ کسی اجنبی کا کام نہیں۔ چنانچہ اس نے تمام لٹنے والوں سے ان کے گھر دعوتوں میں آنے والے مہمانوں کی فہرستیں لے لی تھیں۔ کمپیوٹر نے حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ایسے بارہ افراد کے نام نکال کر دیے تھے جو ان میں سے تقریباً تمام گھروں میں دعوت میں آتے رہتے تھے۔ ان میں پہلا نام ارشد جمال کا تھا۔

ارشد جمال کے متعلق دو سال پہلے نہایت خاموشی سے تفتیش کی گئی تھی اور اس کے نتیجے میں اسے کلیئر قرار دیا گیا تھا۔ محسن نے سوچا' اس کے باوجود دوبارہ چیک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن محسن ایک اور نام میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ تھا جاوید ظفر' جس کی اپنی پبلک ریلیشنگ کی فرم تھی۔ وہ تمام وقت حسین عورتوں کے چکر میں لگا رہتا تھا۔ اس کی آمدنی زیادہ نہیں تھی لیکن وہ روپیہ پانی کی طرح بہاتا تھا۔

ابھی انہوں نے چور کی جو تصویریں لٹنے والوں کو بھیجی تھیں' اس کے ردعمل کے طور پر تین افراد نے چور کے سلسلے میں خیال آرائی کی تھی۔ ایک خاتون کا کہنا تھا کہ یہ اس کے سابقہ شوہر کی تصویر ہے۔ "وہ تو شادی کے بعد دن دہاڑے مجھے لوٹتا رہا تھا۔ وہ ہے ہی لٹیرا اور یہ سو فیصد اسی کی تصویر ہے۔" خاتون نے بڑے جوش سے کہا تھا۔

محسن کو وہ فون کال یاد آئی تو وہ مسکرا دیا۔ خاتون جس شخص کی بات کر رہی تھیں اب وہ قومی اسمبلی کا ممبر تھا۔

☆☆☆

اتوار۔ 5 نومبر!

سفینہ اور طوبیٰ شاہ زیب اکبر کے گھر رات کے کھانے پر مدعو تھیں۔ ڈرائیو

کرتے ہوئے سفینہ سوچ رہی تھی کہ یہ دونوں میاں بیوی کتنی بڑی نعمت ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمیں لگتا ہے کہ ہماری بھی فیملی ہے۔

طوبیٰ نے اسے چونکا دیا ''ممی! جعفر انکل کی ممی کا خیال ہے کہ جعفر انکل آپ کو پسند کرتے ہیں۔ میرا خیال بھی یہی خیال ہے۔ میری ان سے خوب باتیں ہوئیں۔''

سفینہ جھنجلا گئی۔ یہ آج کل کے بچے جو سنیں نقش ہو جاتا ہے اور اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتے ہیں ''کیا باتیں ہوئیں ان سے؟'' اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''اسی بارے میں۔ انکل کی امی کہہ رہی تھیں کہ انکل اس سے پہلے بھی کسی لڑکی کو گھر نہیں لائے۔''

''میں لڑکی نہیں ہوں۔'' سفینہ نے تپ کر کہا۔

''تو آپ پہلی ہیں۔'' طوبیٰ کہتی رہی۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو۔'' سفینہ نے کہا لیکن اسے احساس ہوا کہ یہ بات سن کر اس کی دھڑکنوں کی لے بدل گئی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا اور کوئی پوری طرح اس کے دل میں گھر کر جاتا ہے۔

☆☆☆

سفینہ جانتی تھی کہ شاہ زیب ہاؤس میں بالآخر مختار عظیم کے کیس کا مسئلہ زیر بحث آئے گا لیکن ایسا کھانے کے بعد اس وقت ہو گا' جب وہ لوگ' کافی پی رہے ہوں گے۔ یہ وہ وقت ہو گا جب طوبیٰ' شاہ زیب کا لایا ہو کوئی کمپیوٹر گیم کھیلنے کے لیے لائبریری کا رخ کرے گی۔ ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔

کھانے کے دوران میں سیاست پر' میٹروپولیٹن کے بجٹ پر گفتگو ہوتی رہی۔ ''میری بیٹی طوبیٰ تم سمجھ رہی ہو نا۔'' شاہ زیب نے کہا' یہ سیاست فٹ بال کے کھیل کی طرح ہوتی ہے۔ میئر کوچ ہے اور اس کی پارٹی کے لیڈر کوارٹر بیک ہیں اور عام کونسلر فارورڈ۔''

''آپ کوارٹر بیک ہیں نا؟'' طوبیٰ نے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک سمجھی ہو۔''

سفینہ مسکرائی ''گڑیا تم خوش قسمت ہو کہ اتنی سی عمر میں دادا جیسے آدمی سے سیاست سیکھ رہی ہو۔''

''ارے یہ سب خود غرضی کی باتیں ہیں۔'' شاہ زیب نے ہنس کر کہا ''تمہاری ممی ترقی کرتے کرتے' ایک دن سپریم کورٹ کی چیف جسٹس بن جائیں گی۔ تب ہم جیسے ان کی خوشامد کیا کریں گے۔''

سفینہ نے گہری سانس لی۔ بات شروع ہونے والی تھی اس نے بیٹی سے کہا ''اب تم ذرا کمپیوٹر گیم کی خبر لو جا کر۔''

''آج تمہارے لیے ایک زبردست گیم لایا ہوں طوبی۔'' شاہ زیب کو بہت پیار آتا تو طوبیٰ کو طوبی کہتے تھے۔ تم خوش ہو جاؤ گی۔''

طوبیٰ گئی اور ملازمہ کافی لے آئی۔ ون......ٹو......تھری......سفینہ نے دل میں کہا۔ اس نے شاہ زیب کو استفسار کا موقع نہیں دیا۔ اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا' اس نے خود ہی پوری تفصیل سے شاہ زیب اور تمکنت کو سنا دیا۔ اس نے آخر میں کہا ''یہ طے ہے کہ ڈاکٹر سلمان نے عدالت میں جھوٹ بولا تھا اور یہ بھی طے ہے کہ کوئی اندر کی بات ہے' جس کی وجہ سے امتیاز حیدر نہیں چاہتا کہ یہ کیس ری اوپن ہو ورنہ وہ طوبیٰ کے حوالے سے مجھے دھمکی کبھی نہ دیتا۔''

''وقاص نے سچ مچ یہ کہا تھا کہ طوبیٰ کو کچھ ہو سکتا ہے۔'' تمکنت نے سرد اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

''جی ہاں۔'' سفینہ نے کہا اور التجائیہ نظروں سے شاہ زیب کو دیکھا۔ ''پلیز' آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اظہر عباس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کر رہی ہوں اور یقین کریں' میں جج بھی بننا نہیں چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں بہت اچھی جج ثابت ہوں گی لیکن آپ خود سوچیں' اگر میں پروسیکیوٹر کی حیثیت سے ایک صریح قانونی بے انصافی سے منہ پھیر لوں تو جج کی حیثیت سے کیا خاک انصاف کر سکوں گی۔ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ایک بے قصور شخص جو دس سال سے ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا ہے' مزید بیس سال سزا بھگتے۔''

میں سمجھتی ہوں کہ انسان کو اپنے ضمیر کی آواز نہیں دبانی چاہیے۔ اسے وہ کرنا چاہیے' جو اس کے نزدیک درست ہو۔'' تمکنت نے کہا۔

''میں ہیروئن بننے کی کوشش نہیں کر رہی ہوں۔ اگر کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے تو میں چاہتی ہوں کہ اسے تلاش کروں اور معاملہ مختار کے وکیل جعفر کے سپرد کردوں۔ کل میں ڈاکٹر سلمان سے ملوں گی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ اس کی گواہی کی اہمیت ختم کردی جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ذہنی طور پر ڈاکٹر ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ کسی کا تعاقب کرنا کھلا جرم ہے۔ میں اس حوالے سے اس سے اعتراف کرانے کی کوشش کروں گی کہ اس نے عدالت میں جھوٹ بولا تھا اور یہ کہ اس نے نازنین کو تمام زیورات نہیں دیے' جس کا مطلب ہے کہ اس کے کسی اور شخص سے تعلقات تھے۔ یہ ہوگیا تو کیس کی صورتحال ہی بدل جائے گی۔ جعفر کیس کی دوبارہ سماعت کی اپیل کرے گا اور یہ ہوتے ہوتے اظہر عباس میئر بن چکا ہوگا۔''

''یہ سب کچھ ہو جائے گا میری بچی لیکن تم عدلیہ کا حصہ نہیں رہو گی۔'' شاہ زیب نے کہا ''تم نے جو کچھ کہا' وہ وزن رکھتا ہے اور میں اسے سراہتا ہوں لیکن مجھے یہ فکر ہے کہ تمہیں یہ سودا مہنگا پڑے گا۔ سب سے پہلی فکر تو مجھے طوبیٰ کی ہے۔ تمہیں دھمکی کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔''

''میں نے اسے سنجیدگی سے ہی لیا ہے۔ اب وہ ایک منٹ کے لیے بھی اکیلی نہیں رہے گی۔''

''سنو سنو۔ اگر تمہیں اپنا گھر غیر محفوظ لگے تو طوبیٰ کو یہاں چھوڑ دو۔'' تمکنت نے کہا ''یہاں کے حفاظتی انتظامات کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔''

سفینہ نے تمکنت کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور اسے گرم جوشی سے دبایا۔ ''آپ ہی ہم سے محبت نہیں کرتیں۔ میں بھی آپ دونوں سے محبت کرتی ہوں۔ آپ ہی میری فیملی ہیں۔ اس نے بے حد سچائی سے کہا پھر شاہ زیب کی طرف مڑی ''انکل مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو مایوس کیا۔''

''ایسی بات نہیں۔ مجھے تم پر فخر ہے۔'' شاہ زیب نے کہا ''اور میں جج شپ کے لیے تمہارا نام بھیجنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن ......''

''میں جانتی ہوں کہ اب اس کا امکان نہیں۔ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے اور کبھی ایسی قیمت بھی ہوتی ہے جو ہم ادا نہیں کرسکتے۔''

''آپ اس بات کو چھوڑو سفینہ۔'' شاہ زیب بولے ''لیکن مجھے ہر بات سے باخبر رکھنا۔''

☆☆☆

پیر۔ 6 نومبر:

میڈیا نے فواد اصغر اور مبین چودھری کے دہرے قتل کو خوب اچھالا تھا اور بلاواسطہ طور پر اس کا تعلق امتیاز حیدر کے کیس سے جوڑا تھا۔

دوسری طرف اس دہرے قتل کے سلسلے میں پولیس کو ایک گواہ ملا تھا' جس کی شناخت چھپالی گئی تھی۔ وہ گواہ ایک اے ٹی ایم سے کیش نکلوانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے مبین چودھری کے دفتر والی بلڈنگ کے سامنے سات بج کر دس منٹ پر ایک گہرے نیلے رنگ کی ٹویوٹا کو کھڑے دیکھا تھا۔ گواہ کی کار کا اگلا وہیل کچھ ہلنگ کررہا تھا۔ وہ اسے چیک کرنے کے لیے اترا۔ وہ جھک کر ٹائر چیک کررہا تھا کہ اس نے بلڈنگ کے دروازے سے ایک شخص کو نکل کر ٹویوٹا کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اس کا چہرہ تو نظر نہیں آیا لیکن وہ ایک بھاری گن اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ٹویوٹا کا نمبر نوٹ کرلیا۔ پولیس نے تفتیش کی تو وہ چوری ...... کی کار ثابت ہوئی۔ جس کی رپورٹ گزشتہ روز درج کرائی گئی تھی پھر وہ کار بھی مل گئی اسے ایک سنسان سڑک پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس شہادت نے تفتیش کا رخ بدل دیا۔ اب یہ منصوبہ بندی کے تحت کی گئی قتل کی واردات تھی۔ کوئی یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا لیکن سب جانتے تھے کہ قتل امتیاز حیدر کے حکم پر کیا گیا ہے۔ گواہ قاتل کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کار چوری ...... کی تھی اور آلہ قتل اس وقت یقیناً کسی دریا کی تہ میں پڑا ہوگا۔

پولیس جانتی تھی کہ سرتوڑ کوشش کے باوجود یہ حل ہونے والا کیس نہیں ہے!

☆☆☆

پیر کی صبح تمکنت معمول کے خلاف زیادہ دیر بستر پر رہی۔ سردی میں اس کے

جوڑوں کی تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ مکان کا ہیٹنگ سسٹم بہت اچھا تھا۔ اس کے باوجود سردی اسے اپنی ہڈیوں میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں پیروں کی انگلیاں، گھٹنے، کہنیاں اور ٹخنے بری طرح دکھ رہے تھے۔

برسوں پہلے اس بیماری کے آغاز پر تمکنت نے عہد کیا تھا کہ وہ خود ترسی سے ہمیشہ خود کو محفوظ رکھے گی۔ اب بھی اس کے لیے بڑھتے ہوئے درد سے زیادہ تکلیف دہ یہ بات تھی کہ اس کی سرگرمیاں، اس کے کام متاثر ہو رہے تھے۔ وہ ایسی عورت تھی، جو اپنے شوہر کے تمام کام اپنے ہاتھ سے کرنا پسند کرتی تھی۔ وہ اس کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی اس کی بھرپور اعانت کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے شوہر پر فخر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کی بیماری رکاوٹ نہ بنتی تو وہ سیاسی افق پر بہت اوپر جاتا۔

پچھلی رات کنٹری کلب جا کر ڈنر کرنا اسے بہت اچھا لگا تھا۔ کئی ہفتوں کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ گھر سے نکلی تھی لیکن وہ جو اس آدمی سے ملاقات ہوئی۔ ارشد جمال! کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ اس نے کئی بار شاہ زیب سے پوچھا۔ شاہ زیب نے کہا، ممکن ہے تم نے اسے کسی تقریب میں دیکھا ہو۔

لیکن تمکنت کو یاد تھا کہ تقریبات میں گئے ہوئے اسے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ بارہ سال سے تقریبات میں جانے کا سلسلہ موقوف ہے۔ یہ کوئی اور بات ہے۔ اسے دیکھ کر کچھ یاد آیا تھا۔ اس کی دید نے کسی یاد کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کسی وقت اچانک یاد آ جائے گا۔ اس نے سوچا۔

اس کی ملازمہ افسری کمرے میں ایک ٹرے لے کر آئی۔ اس نے ٹرے اس کے سامنے رکھی اور کھڑکیوں کے پردے کھینچنے لگی پھر کچھ خیال آیا اور اس نے اپنے ایپرن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مسکا ہوا کاغذ نکالا۔ "بیگم صاحبہ یہ صاحب کے کمرے میں ڈسٹ بن میں پڑا تھا۔" اس نے کہا "میں جانتی ہوں کہ صاحب نے اسے پھینک دیا ہے پھر بھی میں نے سوچا کہ آپ سے پوچھ لوں اگر میں یہ لے لوں تو کوئی حرج تو نہیں ہے۔ میرا پوتا سراغ رساں بننے کی بات کرتا ہے۔ وہ یہ تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔" اس نے تصویر تمکنت کی طرف بڑھائی۔

تمکنت نے تصویر دیکھی اور واپس دینے لگی۔ دیتے دیتے اس کا ہاتھ ٹھٹک گیا۔ یہ تصویر شاہ زیب نے اسے جمعے کی شام دکھائی تھی اور مذاق کرنے والے انداز میں کہا تھا "مادام اس شکل کے کسی آدمی کو جانتی ہیں آپ۔" تصویر کے ساتھ تفصیل بھی تھی۔ محکمہ سراغ رسانی نے یہ تصویر ہر اس شخص کو بھیجی تھی، جس کے ہاں پچھلے چند برسوں کے دوران چوری کی کوئی واردات ہوئی ہو اور محکمے کے مطابق یہ چور کی تصویر تھی جو ایک واردات کے دوران میں خفیہ کیمرے نے کھینچی تھی۔ محکمہ سراغ رسانی کا خیال تھا کہ وہ باقاعدہ چور ہے اور ان گنت وارداتوں کا ذمے دار ہے۔ چوری کی یہ وارداتیں ہر گھر میں کسی بہت بڑی تقریب یا دعوت کے کچھ عرصے بعد ہوئی تھیں۔

"مجھے اسمبلی کے ممبر قمر جاوید کے ہاں کی واردات یاد ہے۔ پہلے اس نے الیکشن میں اپنی کامیابی کے سلسلے میں گھر میں جشن منایا تھا۔ اس کے دو ہفتے بعد وہ کسی پارٹی میں جانے والے تھے۔ وہ گئے بھی لیکن اس کی والدہ دل گھبرانے کی وجہ سے جلدی گھر آ گئیں اور ان کا چور سے ٹکراؤ ہو گیا۔ سب لوگ گھر آئے تو زینے کے نیچے ان کی لاش ملی۔ ان کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور بے شمار قیمتی زیورات غائب تھے۔" شاہ زیب نے بتایا تھا۔

"شاید قمر جاوید ہی کی وجہ سے میں نے تصویر کو اتنی توجہ سے دیکھا تھا،" تمکنت نے تصویر کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ چہرے کے زاویے سے پتا چلتا ہے کہ کیمرا اس کے چہرے کے مقابلے میں کافی نیچے تھا۔ اس نے دھندلی تصویر کو پھر غور سے دیکھا۔ پتلی گردن، باریک نکیلی ناک اور سکوڑے ہوئے ہونٹ۔ یوں کسی کے بھی چہرے کو دیکھا جائے تو اس طرح کا نقشہ نہیں دکھائی دیتا لیکن اگر وہیل چیئر پر بیٹھ کر کسی کھڑے ہوئے آدمی کو دیکھیں تو ایسا ہی نظر آئے گا، جیسا اس تصویر میں ہے۔

اور یہ سوچتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا کہ یہ اس شخص ...... ارشد جمال کی تصویر ہے جسے اس نے رات کنٹری کلب میں دیکھا تھا۔ اس نے سوچا، کیا یہ ممکن ہے؟

"افسری...... یہ تھوڑی دیر میرے پاس رہنے دو۔" اس نے ملازمہ سے کہا "اور ہاں، ذرا مجھے ٹیلی فون لا کر دو۔"

چند لمحے بعد وہ فون پر آمنہ بیگم سے گفتگو کر رہی تھی۔ کنٹری کلب میں ارشد جمال سے آمنہ نے ہی اس کو متعارف کرایا تھا۔ اس نے آمنہ کو بتایا کہ وہ اب بھی اسی الجھن میں ہے کہ اس نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے پھر وہ اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔ وہ رہتا کہاں ہے؟ کیا کرتا ہے؟

ریسیور رکھنے کے بعد وہ ٹھنڈی چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اس تصویر کو غور سے دیکھتی رہی۔ آمنہ نے بتایا تھا کہ ارشد جمال فن پاروں اور نوادرات کا ایکسپرٹ ہے اور مرشد آباد کے بڑے حلقوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔

تمکنت نے شاہ زیب کو اس کے دفتر فون کیا ''زیب' میرے خیال میں ارشد جمال وہ چور ہے' جس کی پولیس کو تلاش ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم بہت بڑی بات کہہ رہی ہو جان۔'' شاہ زیب نے محتاط لہجے میں کہا۔

''میری نظر تو تم جانتے ہی ہو کیسی ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا ''تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں بات آگے نہ بڑھاتا۔ خیر' اس تصویر کے کنارے محکمہ سراغ رسانی کا فون نمبر لکھا ہے۔ وہ مجھے دو۔ میں ابھی انہیں فون کرتا ہوں۔''

''نہیں زیب' میرے لیے اتنا کافی ہے کہ تم محکمہ سراغ رسانی کو فون کرنے کے حق میں ہو لیکن فون میں کروں گی۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو اس سے تمہاری پوزیشن کیوں خراب ہو اور اگر میں درست ہوں تو مجھے یہ احساس ہوگا کہ میں اب بھی کارآمد ہوں۔ قمر کی والدہ سے ویسے بھی میری دوستی تھی۔ مجھے اچھا لگے گا کہ ان کے قاتل کو میں نے گرفتار کرایا ہے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر سلمان کا موڈ بہت خراب تھا۔ ویک اینڈ اس نے تنہا گزارا تھا۔ تنہا اور بور۔ اس حقیقت نے اسے اور تنہا کر دیا تھا کہ وہ بابرا سے نہیں مل سکتا۔ ہفتے کا دن بہت خوب صورت تھا۔ اس نے سوچا کہ سی سائیڈ چلا جائے۔ بابرا کے ساتھ۔ اس نے بابرا کو فون کیا۔ اس کا واسطہ جواب دینے والی مشین سے پڑا۔ اس نے کال بیک کا پیغام چھوڑا لیکن بابرا نے اسے جوابی فون انہیں کیا۔ یوں اس کا اتوار بھی تباہ

ہو گیا۔

پیر کی صبح اس نے بابرا کے آفس فون کیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ وہ شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔ یہ بات پریشان کن تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے جھوٹ بتایا گیا ہے کیونکہ جمعرات کو بابرا نے بتایا تھا کہ بدھ کو اسے یہاں اپنے ایک کلائنٹ سے ملنا ہے۔

سو پیر کے دن اس کے لیے اپنے مریضوں پر توجہ مرکوز رکھنا دشوار ہو گیا۔ شکر ہے کہ اس کا شیڈول بہت ٹائٹ نہیں تھا۔ ویسے بھی اب اس کے مریضوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے اپائنٹ منٹ کے بعد بیشتر مریض تو واپس ہی نہیں آتے تھے۔ اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔ ایسی عورتیں کم ہی آتی تھیں' جنہیں حسین بنایا جا سکے۔

اس کا ساڑھے تین بجے کا اپائنٹ منٹ کینسل ہوا تو اس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا پھر اس نے سوچا کہ کار نکالے گا اور بابرا کے دفتر جائے گا۔ عام طور پر وہ پانچ بج کر چند منٹ پر دفتر سے نکلتی تھی لیکن احتیاطاً جلدی پہنچنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ یہ خیال کہ وہ اسے ٹال رہی ہے' اس سے گریز کر رہی ہے' بے حد اشتعال انگیز تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو......

وہ بلڈنگ سے نکلا ہی تھا کہ اسے سفینہ انصار اپنی طرف بڑھتی دکھائی دی۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ مل گئے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے آپ سے بہت اہم اور ضروری بات کرنی ہے۔''

''مس انصار' میرا اسٹاف ابھی موجود ہے۔ وہ آپ کی جو مدد کر سکتے ہیں' کریں گے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

لیکن سفینہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی ''ڈاکٹر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک بے قصور شخص کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کرانے کا ذمے دار نہیں ہے۔''

یہ سن کر ڈاکٹر بری طرح بھڑک گیا۔ ''تمہیں جرأت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی؟'' اس نے سفینہ کا ہاتھ پوری طاقت سے پکڑ لیا۔

سفینہ کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر کا ہاتھ اٹھ بھی سکتا ہے۔ ڈاکٹر کا چہرہ غصے سے مسخ ہو رہا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ متجسس نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگے۔ ایک شخص ان کے پاس رک گیا۔ ''کیا بات ہے خاتون؟'' اس نے سفینہ سے پوچھا ''کوئی پریشانی تو نہیں؟''

''ڈاکٹر اس سوال کا جواب آپ ہی دیں گے۔ بتائیں' مجھے کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔'' سفینہ نے پرسکون لہجے میں ڈاکٹر سے کہا۔

ڈاکٹر نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا ''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

سفینہ اب بھی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ ''ڈاکٹر سلمان' آپ کو ہر حال میں مجھ سے بات کرنی پڑے گی۔ بہتر ہے ابھی سن لیں ورنہ بعد میں صورتحال بہت ناخوش گوار ہوگی۔

ڈاکٹر نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے چلتا رہا۔

سفینہ کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر کی سانس پھول رہی ہے۔ ''آپ جتنا تیز چلنا چاہیں' چلیں۔ میں آپ سے پیچھے نہیں رہوں گی۔'' اس نے کہا ''اب یہ بتائیں کہ اپنے آفس چلیں گے۔ یا کہیں بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے بات کریں گے۔ بہر حال ہمیں بات کرنی ہے ورنہ کسی عورت کا پیچھا کرنے اور ستانے کے الزام میں آپ اندر ہو جائیں گے۔''

''کیا...... کیا کہہ رہی ہو تم؟'' ڈاکٹر ٹھہر گیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''جی ہاں' بابر' ذیشان آپ سے خوف زدہ ہے۔ کیا اسی طرح آپ نازنین کو بھی ڈراتے تھے۔ جس رات وہ قتل ہوئی' آپ وہاں موجود تھے' دو گواہوں نے آپ کی سیاہ فاکسی وہاں کھڑی دیکھی تھی۔ اس کا نمبر بھی دیکھا تھا۔ جزوی طور پر ہی سہی۔ اب بتائیں' آپ مجھ سے کہاں بات کرنا پسند کریں گے؟''

ڈاکٹر چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا۔ حیرت کی جگہ اب اس کی نگاہوں میں دہکتی ہوئی نفرت تھی پھر دھیرے دھیرے وہ بے بسی سے بھر گئیں۔ ''میں سڑک کے پار رہتا ہوں۔'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت تک وہ موڑ پر پہنچ چکے

تھے۔

سفینہ کے کے لیے وہ دعوت تھی۔ اب سوچنا یہ تھا کہ کہیں وہ اس کے گھر جا کر غلطی تو نہیں کر رہی ہے۔ ڈاکٹر متشدد آدمی معلوم ہوتا تھا پھر اس نے سوچا کہ ایسا موقع شاید دوبارہ نہ ملے۔ اسے ضائع کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر ایک مکان کے دروازے پر رکا۔ اس نے چابی لگائی' دروازہ کھولا اور بولا ''اگر تم ضروری سمجھتی ہو تو چلو مس انصار۔''

☆☆☆

جن مکانوں میں چوریاں ہوئی تھیں' ان میں ہونے والی دعوتوں کے شرکاء کی جانب سے اطلاعات موصول ہونے کا سلسلہ جاری تھا۔ اب ان کے پاس بارہ ایسے مشکوک افراد کی فہرست موجود تھی' جو چور کے حلیے پر پورے اترتے تھے لیکن پیر کی سہ پہر انسپکٹر محسن کا دل خوش ہوگیا۔ اس کی نظروں میں جو شخص سب سے مشکوک تھا' اس نے اعتراف کرلیا تھا کہ اس کی پبلک ریلیشنگ فرم اس کی اصل سرگرمیوں کے لیے ایک آڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ جاوید ظفر تھا۔

جاوید کو پوچھ گچھ کے لیے ہیڈ کوارٹر لایا گیا۔ انسپکٹر محسن کو لگ رہا تھا کہ وہ اعتراف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائے گا۔

جاوید نے سرگوشی میں کہا ''آپ نے کبھی ''افواہ'' پڑھا ہے؟''

''یہ تو ایک تھرڈ کلاس روزنامے کا نام ہے۔''

''جی ہاں' تھرڈ کلاس مگر خطرناک حد تک سچا۔'' جاوید نے کہا۔ ''یہ بات اس کمرے سے باہر نہیں جانی چاہیے ورنہ میرے تمام دوست' مجھے چھوڑ دیں گے۔ سب مجھ سے خفا ہو جائیں گے۔''

''تم بات تو بتاؤ۔'' انسپکٹر محسن جھنجھلا گیا۔

''میں اس اخبار کا چیف رپورٹر ہوں۔''

چند منٹ بعد انسپکٹر نے اسے رخصت کر دیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ بزدل افواہ نویس چوری کی اتنی دلیرانہ اور منظم وارداتیں کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔

سوا چار بجے اس کے تین ماتحتوں میں سے ایک اس کے کمرے میں آیا ''سر

تمکنت اکبر نامی کوئی خاتون فون پر آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ اس کیس کے بارے میں۔ ان خاتون کے شوہر کونسلر ہیں اور میئر صاحب کے دست راست۔ وہ کہتی ہیں کہ ہمارا مطلوبہ آدمی ارشد جمال ہے۔"

محسن نے ریسیور اٹھایا اور بولا "خاتون تمکنت' میں انسپکٹر محسن بول رہا ہوں۔"

پھر وہ دوسری طرف کی گفتگو سنتا رہا۔ یہ خاتون ایسی گواہ معلوم ہوتی تھیں' جن کی پولیس والے آرزو کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ بے حد منطقی تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے وہیل چیئر پر بیٹھ کر ارشد جمال کو دیکھا تھا اور شاید تصویر لیتے وقت خفیہ کیمرے کی پوزیشن بھی یہی رہی ہوگی۔ کیا استدلال ہے؟ محسن نے سوچا۔

"براہ راست دیکھا جائے تو اس کا چہرہ بھرا بھرا لگتا ہے۔" تمکنت فون پر کہہ رہی تھی "جب کہ تصویر میں وہ استخوانی لگتا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں نے شاید اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس پر اس نے ہونٹ سکوڑے تھے۔ میرا خیال ہے' جب وہ کسی چیز پر توجہ مرکوز کرتا ہے تو ہونٹ سکوڑتا ہے۔ یہ اس کی عادت ہے۔ یہی حال تصویر کا ہے۔ میرا خیال ہے' جب کیمرے نے تصویر لی تو وہ کسی چیز کو غور سے دیکھ رہا ہوگا۔ شاید کسی چیز کے اصلی یا نقلی ہونے کے بارے میں فیصلہ کر رہا ہوگا اور میری سہیلی کا کہنا ہے کہ وہ فن پاروں' جواہرات اور نوادرات کا ایکسپرٹ ہے۔"

"جی ہاں' یہ سچ ہے۔" انسپکٹر کے لہجے میں ہیجان تھا۔ "بیگم صاحبہ' میں بتا نہیں سکتا ہوں کہ میں اس کال پر آپ کا کتنا شکر گزار ہوں۔"

انسپکٹر محسن نے ریسیور رکھتے ہی ماتحتوں کو طلب کرلیا۔ "اس ارشد جمال کی ہر لمحے نگرانی کرنی ہے۔ جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو لگا دو۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا جائے۔ دو سال پہلے اسے کلیئر قرار دیا گیا تھا۔ اگر وہ ہمارا مطلوبہ آدمی ہے تو وہ باکمال آدمی ہے۔ کوئی نشان نہیں چھوڑتا۔ اس کا پیچھا کرتے رہو۔ ہوسکتا ہے' وہ ہمیں وہاں تک پہنچا دے جہاں وہ چوری کا مال رکھتا ہے۔" اس نے ہدایت دیتے ہوئے کہا "اور اگر یہ وہی چور ہے تو ہمیں اس پر رکن اسمبلی کی ماں کے قتل کا الزام بھی عائد کرنا ہے۔ قمر جاوید صاحب کی مقتول والدہ کی

صدر صاحب کی والدہ سے بہت دوستی تھی۔ چیف چاہتا ہے کہ ہم یہ کیس جلد از جلد حل کرلیں۔"

☆☆☆

ڈاکٹر سلمان کی اسٹڈی صاف ستھری تھی لیکن وہاں ہر چیز پرانے زمانے کی تھی اور بوسیدہ لگ رہی تھی۔ کھڑکی کے پردوں کا بھی یہی حال تھا۔ کثرت استعمال سے ان کا رنگ اڑ گیا تھا۔ غرض وہ ایسا کمرا لگتا تھا' جہاں وقت ٹھہر چکا ہو اور ہر چیز منجمد ہو۔

سفینہ ایک کرسی پر جم کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے اخلاقاً بھی اسے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔

ڈاکٹر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم کا تناؤ واضح تھا "ہاں مس انصار' اب بتاؤ' تم کیا چاہتی ہو۔" چشمے کے پیچھے سے جھانکتی اس کی آنکھیں سفینہ کو اپنے جسم میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"میں سچ جاننا چاہتی ہوں۔" سفینہ نے کہا "میں جاننا چاہتی ہوں کہ نازنین کو جو دوسرے مردوں نے زیورات دیے' آپ نے انہیں اپنے دیے ہوئے کیوں کہا۔ کیوں جھوٹا بولا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپ نے مختار کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا۔ مختار نے نازنین کو کبھی کوئی دھمکی نہیں دی۔ آپ نے حلف اٹھا کر یہ جھوٹ کس وجہ سے بولا؟"

"مختار نے میری بیٹی کو قتل کیا تھا۔ اس نے اس بے رحمی سے نازنین کا گلا گھونٹا کہ اس کی زبان باہر لٹک گئی اور آنکھیں حلقوں سے نکل آئیں۔ وہ مرنے کے بعد ایسے لگ رہی تھی جیسے کوئی بے زبان جانور......" ڈاکٹر غصے سے کہہ رہا تھا۔ اچانک اس کی آواز ڈوب گئی اور وہ سسکنے لگا۔

"میں جانتی ہوں ڈاکٹر کہ وہ سب آپ کے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا۔" سفینہ نے نرم لہجے میں کہا "لیکن آپ مختار کو ہی کیوں مجرم سمجھتے ہیں؟"

"وہ نازنین کا شوہر تھا۔ وہ پاگل پن کی حد تک جیلس تھا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔"

"ڈاکٹر! آپ غلطی پر ہیں۔ مختار جیلس نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کسی اور سے ملتی ہے۔" سفینہ نے کہا۔ چند لمحے وہ ڈاکٹر کے کچھ کہنے کی منتظر رہی پھر بولی "اور وہ خود بھی ایک عورت سے مل رہا تھا۔"

ڈاکٹر یوں سمٹا جیسے سفینہ نے اسے تھپڑ مارا ہو۔ "یہ ناممکن ہے۔ اس نے ایک غیر معمولی حسین عورت سے شادی کی تھی۔ وہ اس کی پرستش کرتا تھا۔"

"وہ نہیں ڈاکٹر! نازنین کی پرستش تم کرتے تھے۔" سفینہ کو توقع نہیں تھی کہ وہ یہ بات کہے گی لیکن جب اس نے کہہ دیا تو اسے یقین ہوگیا کہ اس نے درست کہا ہے "تم خود کو مختار کی جگہ رکھ کر دیکھتے اور سوچتے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں نا۔ اگر تم نازنین کے شوہر ہوتے اور تمہیں پتا چلتا کہ وہ تم سے بے وفائی کر رہی ہے تو تم یقیناً اسے قتل کر دیتے۔ ہے نا؟" وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے پلک بھی نہیں جھپکائی "تمہاری یہ جرأت؟ نازنین میری بیٹی تھی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا "اب نکل جاؤ یہاں سے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے دھکے دے کر نکال دے گا۔

سفینہ تیزی سے اٹھی اور دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس نے جائزہ لیا کہ دروازے کا راستہ صاف ہے یا نہیں۔ "نہیں ڈاکٹر! تمہاری بیٹی نازو تھی۔ نازنین نہیں۔ نازنین تو تمہاری تخلیق تھی اور تم اسے اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اب بابرا ذیشان کو اپنی ملکیت سمجھتے ہو اور مجھے معلوم ہے کہ جس رات نازنین قتل ہوئی، تم وہاں موجود تھے۔ مجھے بتاؤ کیا تم نے اسے قتل کیا تھا؟"

"میں نازنین کو قتل کروں گا! تم پاگل تو نہیں ہو؟"

"لیکن تم وہاں موجود تو تھے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تم موجود تھے اور میں یہ بات ثابت کر دوں گی۔ میں اس کیس کو ری اوپن کراؤں گی تاکہ اس بے قصور شخص کو رہائی ملے۔ تم اس سے رقابت محسوس کرتے تھے۔ تم نے اسے سزا دلوائی کیونکہ وہ ہر وقت نازنین کے پاس رہتا تھا۔ جب کہ تم نازنین سے ملنے کو ترستے تھے۔"

"یہ سچ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

سفینہ نے دیکھا کہ ڈاکٹر کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا ہے۔ اس نے اپنی آواز نیچی اور لہجہ نرم کر لیا۔ "ڈاکٹر! آپ نے اپنی بیٹی کو قتل نہیں کیا لیکن کسی نے تو کیا ہے۔ اور میں بتا دوں کہ مختار نازنین کا قاتل نہیں ہے۔ آپ اپنے انداز میں نازنین سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ قاتل کو سزا دلوانا چاہتے تھے مگر میں بتاؤں، آپ نے کیا کیا ہے۔ آپ نے نازنین کے قاتل کو کھلی چھوٹ دے دی۔ وہ آپ کو دعائیں دیتا ہوگا۔ اگر ہمارے پاس وہ زیورات ہوتے جو نازنین کو دوسروں نے دیے تھے تو ہم ان کے ذریعے ان تک پہنچ سکتے تھے۔ مختار کو یقین ہے کہ اس رات کم از کم دو چیزیں چوری ہوئی ہیں۔"

"وہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"جی نہیں، وہ جڑاؤ فریم چوری ہوا ہے۔ جس میں نازنین کی سب سے خوب صورت تصویر تھی۔ وہ نائٹ ٹیبل پر رہتا تھا۔ آپ نے تو نہیں لیا۔"

"جس رات میری بیٹی کا قتل ہوا، میں اس کے گھر گیا ہی نہیں تھا۔"

"تو پھر کسی نے آپ سے آپ کی سیاہ فاکسی مستعار لی ہوگی۔ اس کا نام بتائیں۔"

"گیٹ آؤٹ۔" ڈاکٹر غرایا۔

سفینہ سمجھ گئی کہ اب وہاں رکنا مناسب نہیں ہوگا۔ وہ اس سے فاصلے پر رہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ پلٹی "ڈاکٹر سلمان! بابرا ذیشان نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ آپ سے خوف زدہ ہے۔ اس خوف کی وجہ سے وہ ایک کاروباری ٹرپ پر شہر سے باہر چلی گئی ہے۔ صرف آپ سے بچنے کے لیے حالانکہ اس ٹرپ پر اسے اگلے ماہ جانا تھا۔ اب جیسے ہی وہ واپس آئے گی، آپ کے خلاف باضابطہ پولیس میں رپورٹ درج کرائے گی۔ میں اسے یہی مشورہ دوں گی۔"

اس نے دروازہ کھولا، سرد ہوا کا جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا "ہاں، آپ یہ تسلیم کر لیں کہ آپ کو نفسیاتی مدد کی ضرورت ہے تو اور بات ہے اور آپ مجھے مطمئن کر دیں کہ آپ نے وقوعہ کی رات کے متعلق سچ بتا دیا ہے اور آپ مجھے وہ زیورات دے دیں،"

جو آپ جانتے ہوں کہ کسی اور شخص نے نازنین کو تحفے میں دیے تھے۔ اس صورت میں میں آپ کو اس بے عزتی سے بچالوں گی سوچ لیں۔''

وہ باہر نکل آئی۔ اس نے اپنی گاڑی ڈاکٹر کے مطب سے کچھ دور کھڑی کی تھی۔ وہاں تک پیدل جاتے ہوئے اسے نہ تو اس بات کا احساس تھا کہ ڈاکٹر اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے اور نہ اس نے اس اجنبی کو دیکھا' جو قریب کھڑی کار میں بیٹھا تھا۔ اس اجنبی نے اسے ڈاکٹر کے گھر سے نکلتے دیکھا تو فوراً اپنے سیلولر فون پر کوئی نمبر ملایا اور اس کے متعلق رپورٹ دینے لگا۔

☆☆☆

ڈی آئی جی مرشد آباد حسن برنی نے عدالت سے مرحوم فواد اصغر کے گھر اور فلیٹ کی تلاشی کے لیے باضابطہ سرچ وارنٹ حاصل کیا تھا۔ فلیٹ میں وہ اپنی بیوی اور ایک بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ گھر میں وہ اس وقت آتا' جب اسے تنہائی کی ضرورت ہوتی۔ بعض اوقات وہ وہاں کئی کئی دن قیام کرتا۔ پڑوسیوں کا کہنا تھا کہ فواد کبھی کسی سے کھلا ملا نہیں۔

پولیس کو اس بات کا یقین تھا کہ فواد اصغر کے پاس امتیاز حیدر کے خلاف ٹھوس ثبوت ہوں گے۔ انھی کے بل پر وہ پولیس اور استغاثہ سے اپنے لیے رعایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے مکان میں ایک کیبن تھا...... بہت خوب صورت کیبن۔ وہ اس نے خود ہی بنایا تھا۔ کسی سے بھی مدد لیے بغیر۔ پڑوسی بتاتے تھے کہ اسے کارپینٹر کے کام کا شوق تھا بلکہ کیبن بنانے کے بعد اس نے بڑے فخریہ انداز میں اپنے چند پڑوسیوں کو بلا کر اپنا کام دکھایا بھی تھا۔

پولیس نے پہلے تو فلیٹ چھان مارا لیکن وہاں کچھ نہیں ملا پھر وہ مکان کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں احساس تھا کہ انہیں جلد از جلد ثبوت اور شواہد تلاش کر لینے چاہئیں۔ ورنہ امتیاز حیدر کے آدمی اس کے خلاف ہر ثبوت مٹانے کی کوشش کریں گے۔

مکان کی تلاشی بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ فواد کی بیوہ نے بڑا واویلا کیا کہ پولیس کو اس کے املاک تباہ کرنے کا کوئی حق نہیں لیکن پولیس نے سب کچھ ادھیڑ کر

رکھ دیا تھا۔ انہوں نے کیبن کو بھی تلپٹ کر دیا۔

ڈرائنگ روم میں پینل کی دیواریں تھیں۔ ٹی وی اور وی سی آر رکھنے کے لیے پوری دیوار کے سائز کا ایک ڈیوائیڈر تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ ایک بار رکھے جانے کے بعد اسے کبھی ہلایا نہیں گیا تھا۔ پولیس نے اس ڈیوائیڈر کو ہٹا کر دیکھا پیچھے پینل کی دیوار تھی۔

مایوس ہو کر پولیس نے اس دیوار کا پینل اکھیڑ دیا۔ کچھ اس کی وجہ یہ تھی کہ دیوار کی موٹائی انہیں نسبتاً زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ پینل ہٹا تو وہ حیران رہ گئے' وہاں ایک خفیہ تجوری موجود تھی۔

باہر پولیس والے جمع تھے۔ ٹی وی کا عملہ بھی تھا۔ محکمہ سراغ رسانی سے تجوریوں کے ایکسپرٹ کو بلایا گیا۔ اس نے پندرہ منٹ میں تجوری کھول دی۔ اس کے ذرا دیر بعد شام کے سوا چار بجے ڈی آئی جی اور میڈیا کے درمیان اہم نوعیت کی گفتگو ہوئی۔

تجوری سے امتیاز انٹر پرائز کے اکاؤنٹس رجسٹر برآمد ہوئے۔ اہم دستاویزات اور نوٹس اس کے علاوہ تھے۔ یہ سب کچھ پچھلے پندرہ برسوں سے متعلق تھا۔ فواد کی ڈائری میں ملاقاتوں کی تفصیل موجود تھی۔ امتیاز نے کب کس سے ملاقات کی' سب اس ڈائری میں موجود تھا پھر جوتوں کے کچھ باکس تھے جن میں مہنگی خریداری کی رسیدیں تھیں۔ ان میں زیادہ تر زیورات کی رسیدیں تھیں جو امتیاز نے اپنی مختلف محبوباؤں کے لیے خریدے تھے۔ ان پر فواد کا نوٹ تھا...... ''سیلز ٹیکس کی ادائیگی نہیں کی گئی۔''

''یہ تو خزانہ ہے خزانہ۔'' ایس پی شبیر نے حسن برنی سے کہا ''فواد نے پہلے ہی دن اپنے بچاؤ کی تیاری کر رکھی تھی۔''

''اور اب ہم فواد کو بچانا تو دور کی بات ہے' اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتے۔'' حسن برنی نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اتوار کے دن ارشد جمال دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ اس کی فلو کی سی کیفیت تھی۔ اس نے شام نگر جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور وہ دن اپنے مرشد آباد والے گھر میں ہی

گزارا۔ وہ مطالعے میں مصروف رہا۔ ایک بار اس نے محکمہ سراغ رسانی کے پمفلٹ پر اپنی تصویر دیکھی۔ وہ مطمئن ہو گیا کہ اس تصویر کو دیکھ کر اسے کوئی نہیں پہچان سکتا۔

پیر کی شام تک اس کی طبیعت کافی بہتر ہو گئی۔ وہ پوری طرح قائل ہو چکا تھا کہ اس تصویر سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ محفوظ ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ منگل اور بدھ کے روز وہ شام نگر جائے گا اور چند خوش گوار دن اپنے لوٹے ہوئے خزانے کے ساتھ گزارے گا۔

اسے علم نہیں تھا کہ اس وقت تک محکمہ سراغ رسانی اس کا فون ٹیپ کرنے کے لیے عدالت سے اجازت نامہ لے چکا ہے۔ یہی نہیں وہ چار شفٹوں میں چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اسے خیال ہی نہیں تھا کہ اب اس کی نقل و حرکت پولیس کی نگرانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

☆☆☆

پیر کی رات سفینہ گھر پہنچی تو آیا جا چکی تھی اور طوبیٰ جعفر کے ساتھ کچن میں تھی "میں نے سوچا آج تمہیں اپنے ہاتھ کا کھانا کھلایا جائے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "سیدھا سادہ سا سلیبو ہے۔ کڑاہی گوشت۔"

سفینہ کے اعصاب بھی کشیدہ تھے اور اسے بھوک بھی لگ رہی تھی "خوشبو تو بڑی زبردست ہے۔ میرے تو منہ میں پانی بھرا آ رہا ہے۔"

جعفر نے اسے غور سے دیکھا "بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔" "ہاں بہت سخت دن گزارا ہے۔"

"ممی میں انکل کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اب آپ آ گئی ہیں تو مجھے یاد آیا کہ ابھی مجھے ہوم ورک بھی کرنا ہے۔" طوبیٰ نے کہا۔ "لیکن کیونکہ خطرہ مجھے ہے اس لیے آپ دن بھر کی رپورٹ مجھے بھی سنائیں۔ آپ ڈاکٹر انکل سے ملی تھیں۔ کیا ہوا؟"

"تم ہوم ورک کرو۔ تمہیں میں بعد میں سب کچھ بتا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے ممی۔"

جعفر نے جلدی سے کافی بنائی۔ وہ دونوں اسٹڈی میں چلے گئے۔ "تمہیں میری بے تکلفی بری تو نہیں لگی؟" جعفر نے پوچھا۔

سفینہ نے نفی میں سر ہلایا اور مسکرا دی "نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں بلکہ مجھے تو اچھا لگا ہے۔"

"اچھا اب بتاؤ۔ ڈاکٹر سے ملاقات کیسی رہی؟"

"میں نے کہا تھا نا وہ ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ میں نے اسے دھمکایا ہے۔ اب بھی اگر اس نے سچ نہیں بولا تو اگلے مرحلے میں میں باہرا سے اس کے خلاف رپورٹ درج کراؤں گی۔ اس دھمکی پر وہ دہل گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ حقیقت اگل دے گا۔ ہمیں بہت سے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے۔"

سفینہ آتش دان میں تھرکتے شعلوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ "میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ شاید تم نے مختار کو سزا دلوانے میں اتنی کوشش اس لیے کی ہے کہ تم نے ہی نازنین کو قتل کیا ہو گا اور جعفر میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر نازنین کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ بیٹی کی محبت نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ اسے عورت کی حیثیت سے بھی نہ چاہتا ہو۔ شاید وہ اسے اپنا شاہکار سمجھ کر اس سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا تھا۔" اس نے نظریں اٹھا کر جعفر کو دیکھا "اب ذرا سوچو...... تصور کرو۔ ڈاکٹر سلمان اپنی گاڑی میں نازنین سے ملنے جاتا تھا۔ مختار آ کر جا چکا ہے۔ نازنین گلدان میں پھول ارینج کر رہی ہے۔ ہاں یہ یاد رکھنا کہ پھولوں کے ساتھ جو کارڈ تھا وہ قتل کے بعد نہیں ملا۔ بہر حال ڈاکٹر غصے میں ہے۔ وہ رقابت کی آگ میں جل رہا ہے۔ وہ کارڈ دیکھتا ہے۔ اب اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ تو مختار سے جلتا تھا۔ یہاں تو امتیاز حیدر بھی ہے۔ وہ غصے میں آپے سے باہر ہو کر نازنین کو قتل کر دیتا ہے اور کیونکہ اسے مختار سے نفرت ہے لہٰذا وہ کارڈ اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور عدالت میں یہ الزام لگا کر کہ مختار نازنین سے جلتا تھا اسے دھمکی دیتا تھا اس کا بیڑا غرق کر دیتا ہے۔"

"کہانی تو تمہاری منطقی ہے لیکن پھر امتیاز حیدر اس کیس کے ری اوپن ہونے سے کیوں خوف زدہ ہے؟"

"میں نے اس سلسلے میں بھی سوچا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس رات امتیاز کا نازنین سے جھگڑا ہوا اور امتیاز نے نازنین کو قتل کر دیا ہو۔"

"یہ دونوں زاویے حقیقت سے قریب تر لگتے ہیں۔" جعفر نے کہا "لیکن تم نے شام کی خبریں نہیں سنیں۔"

"نہیں' میں تھکی ہوئی تھی اور کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔"

"بہر حال اب سن لو۔ فواد اصغر کے پاس امتیاز حیدر کے خلاف جتنے بھی ثبوت تھے اب وہ پولیس کی تحویل میں ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ فواد نے ریکارڈ سنبھال کر رکھنے کی حد کر دی۔ اب اگر اظہر عباس عقل مند آدمی ہے تو وہ تمہاری تفتیش رکوانے کی کوشش کرنے کے بجائے تمہارے ساتھ تعاون کرے گا۔ امتیاز نے نازنین کی موت سے پہلے جو زیورات خریدے' انہیں چیک کیا جانا چاہیے۔ اگر اس میں وہ برج جدی والا بریسلیٹ موجود ہے تو ڈاکٹر تو جھوٹا ثابت ہو جائے گا نا۔" جعفر کے لہجے میں سنسنی در آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا "بھئی سفینہ' مجھے لگتا ہے' تمہاری محنت رنگ لانے والی ہے۔ خیر پہلے میں تمہیں کھانا کھلا دوں۔" وہ کچن کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

جعفر نو بجے رات رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد طوبیٰ نے سفینہ سے کہا "ممی...... یہ ڈیڈی جس شخص کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں' لگتا ہے وہ اسے نہیں بچا سکیں گے۔ ممی' ڈیڈی یہ کیس ہار گئے تو یہ ان کے لیے برا ہو گا؟"

"نہیں بیٹی' کیس ہارنا تو کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا لیکن تمہارے ڈیڈی کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ یہ کیس ہار جائیں۔"

"اور ممی' آپ کو یقین ہے کہ مجھے ڈرانے والے یہ امتیاز صاحب ہی ہیں؟"

"ہاں بیٹی' مجھے ہی نہیں' تمہارے ڈیڈی کو بھی یقین ہے لیکن امتیاز اگر نازنین کے کیس میں ملوث ہو گیا تو پھر اس کے پاس تمہیں ڈرانے کا جواز نہیں رہے گا۔"

"اور جعفر انکل ان کے وکیل ہیں جو سزا بھگت رہے ہیں۔"

"ہاں گڑیا۔"

"جعفر انکل امتیاز صاحب جیسے آدمی کے وکیل بن سکتے ہیں؟"

"میں تو نہیں سمجھتی کہ وہ ایسا کریں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے ممی۔" طوبیٰ نے پرخیال لہجے میں کہا۔

ساڑھے نو بجے سفینہ کو یاد آیا کہ اس نے شاہ زیب اور تمکنت سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں ڈاکٹر سلمان سے ملاقات کے نتائج کے بارے میں بتائے گی۔ اس نے انہیں فون کیا اور تفصیلی رپورٹ دی۔

"تمہارا خیال ہے ڈاکٹر اعتراف کرلے گا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا؟" شاہ زیب نے پوچھا۔

"جی' میرا تو یہی خیال ہے۔"

ایکس ٹینشن پر تمکنت بھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔ "زیب...... اب مجھے سفینہ کو اپنی نیوز سنانے دو۔" اس نے مداخلت کی۔ "سفینہ' آج میں نے بھی کچھ کیا ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ کارنامہ انجام دیا ہے یا خود کو احمق ثابت کیا ہے۔"

ارشد جمال کے بارے میں سن کر سفینہ سوچ میں پڑ گئی۔ ارشد جمال' نازنین کا دوست تھا۔ اگر وہ چور تھا تو وہ ایک قتل میں بھی ملوث تھا۔ تو کیا...... نازنین مرڈر کیس میں اس کی کیا حیثیت تھی۔ کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟ یہ کیس اور الجھ رہا تھا۔

☆☆☆

سفینہ کو اپنے گھر سے نکالنے کے بعد ڈاکٹر سلمان احسن دیر تک ایک جگہ بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وجود جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ پیچھا کرنے والا' نفسیاتی مریض' قاتل' جھوٹا! سفینہ نے کیسے کیسے القابات سے نوازا تھا اسے۔ وہ سوچتا اور اس کا وجود سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگتا۔ یہ وہ کیفیت تھی جو اس وقت ہوتی تھی' جب وہ کوئی بدصورت' بھدا چہرہ دیکھتا تھا۔ وہ اسے تبدیل کرنے' خوب صورت بنانے کے لیے مچلتا اور اس خواہش کے بوجھ سے اس کا پورا وجود کانپنے لگتا۔

پیچھا کرنے والا...... نفسیاتی مریض! صرف اس لیے کہ جو تقریباً کامل حسن اس نے تخلیق کیا تھا' اس کی ایک جھلک دیکھنے سے اسے بہت بڑی خوشی ملتی تھی اور کیا وہ سمجھتی ہے کہ وہ نازنین کو...... اپنی بیٹی کو قتل کر سکتا تھا؟ قتل! وہ اس لمحے کو دوبارہ جینے کی جلتی تپتی اذیت سے دوچار ہو گیا۔ وہ لمحہ جب اس نے نازنین کو ہال میں دیکھا تھا۔ نازنین...... نہیں' وہ نازنین تو نہیں تھی۔ وہ تو ایک مسخ شدہ نقوش والی تباہ شدہ مخلوق تھی' جس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔ جس کی زبان منہ

سے باہر لٹکی ہوئی تھی اور اتنی سوج چکی تھی کہ دوبارہ اس کے دہن میں سما نہیں سکتی تھی۔ وہ' وہ شاندار مخلوق نہیں تھی' جسے اس نے تخلیق کیا تھا۔ حد یہ ہے کہ اس کا جسم بھی بدہیئت اور عجیب لگ رہا تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا مڑا تڑا جسم۔ دائیں ٹانگ کے نیچے دبی' مڑی ہوئی بائیں ٹانگ ...... اور لاش پر بکھرے ہوئے وہ گلاب' جیسے زندگی اور حسن کا تمسخر اڑا رہے ہوں ...... جیسے موت کو خراج تحسین پیش کر رہے ہوں۔

اسے یاد تھا' اس نے نازنین کو کیسے کیسے کوسا تھا۔ کتنا برا بھلا کہا تھا کیونکہ اس نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ اس کے مشوروں پر کان نہیں دھرا تھا۔ وہ منع کرتا رہ گیا تھا اور نازنین نے مختار سے شادی کر لی تھی۔ ''تھوڑا انتظار کر لو۔'' اس نے کہا تھا۔ ''میری گڑیا' یہ شخص تمہارے لائق نہیں ہے۔''

''آپ کو کبھی کوئی شخص میرے قابل نہیں لگے گا۔'' وہ جواب میں چلائی تھی۔

وہ برداشت کرتا رہا تھا۔ کیسے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ کیسے میز کے نیچے ان کے ہاتھ بے تاب جسموں کی طرح آپس میں مل جاتے تھے۔ کیسے وہ جڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ بڑی اذیت سہی تھی اس نے مگر اس سے بڑی اذیت اسے اس وقت سہنی پڑی' جب نازنین کے مزاج کے تلون نے رنگ دکھانا شروع کیا۔ وہ دوسرے مردوں کے ساتھ فلرٹ کرنے لگی۔ چھپ چھپ کر ملنے لگی ان سے اور ان میں سے کوئی بھی اس کے لائق نہیں تھا اور پھر وہ مدد کے لیے اس کے پاس آتی ...... اور کہتی۔ پاپا' آپ مختار سے کہیے گا کہ یہ زیور آپ نے مجھے دیا ہے ...... اور یہ بھی ......اور یہ بھی یا پھر وہ کہتی۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ ماضی کی تمام محرومیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔ اب یہ ازالہ ہی تو ہو رہا ہے۔ میں خواب انجوائے کر رہی ہوں۔ مجھے تو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا اور مختار...... اس کے ساتھ مزہ نہیں آتا۔ دوست محنتی ہے۔ ہر وقت کام کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

اور قاتل؟ نہیں...... قاتل تو مختار ہی تھا۔ جب ڈاکٹر نے نازنین کی لاش کو دیکھا تو سمجھ لیا تھا کہ کیا ہوا ہوگا ...... کیا ہوا ہے۔ مختار گھر آیا ہوگا اور اس نے نازنین کو کسی اور کے بھیجے ہوئے پھولوں میں گھرا دیکھا ہوگا اور وہ پھٹ پڑا ہوگا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی غصے سے پاگل ہو جاتا ...... پھٹ پڑتا پھر اسے نازنین کی

لاش کے نیچے دبا وہ کارڈ نظر آیا۔

تب وہ کھڑا سوچتا رہا۔ عدالت اس شوہر کے ساتھ نرم رویہ رکھے گی جس نے وقتی اشتعال میں بیوی کو قتل کیا ہو۔ مختار کو ہلکی سزا ہوگی۔ اسے رعایت دی جائے گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ اسے سزا ہی نہ ہو۔ اس نے سوچا' یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔ اسے یاد تھا اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور نازنین کے مسخ شدہ چہرے کی جگہ تصور میں اس کے تروتازہ چہرے کو دیکھا تھا اور اس نے کہا تھا ...... ''میری گڑیا' یہ میرا وعدہ ہے۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔''

اور اس وعدے کا ایفا مشکل نہیں تھا۔ اسے بس وہ کارڈ چھپا لینا جو پھولوں کے ساتھ آیا تھا اور اسے گھر جا کر انتظار کرنا تھا۔ اس کال کا جو آ کر رہتی۔ اسے بتایا جاتا کہ اس کی بیٹی نازنین قتل کر دی گئی ہے۔

پولیس نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ مختار حاسد شوہر تھا۔ قابضانہ فطرت کا مالک! اور وہ نازنین کو دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ نازنین کو اس سے زندگی کا خطرہ تھا اور اس نے نازنین کی آخری التجا بھی قبول کر لی۔ اس نے پولیس سے کہہ دیا کہ نازنین کے پاس مختار کے دیے ہوئے زیورات کے علاوہ جو کچھ بھی تھا' وہ اس نے نازنین کو دیا تھا۔

اور اب سفینہ انصار جو جی چاہے کہے' جو چاہے کرتی پھرے۔ قاتل جیل میں ہے اور جیل میں رہے گا۔

رات دس بجے کے قریب وہ اٹھا۔ اس نے سوچا' کھیل ختم ہو چکا۔ اب وہ کبھی سرجری نہیں کر سکے گا۔ بدصورتی سے نہیں لڑ سکے گا۔ اسے خوب صورتی سے نہیں بدل سکے گا اور اسے بابر ذیشان کو دیکھنے کی اب کوئی خواہش نہیں۔ اس نے اسے مایوس کیا ہے۔ احسان فراموش لوگ اچھے نہیں ہوتے۔ وہ بیڈ روم میں گیا۔ الماری کھولی۔ سیف کھولا اور پستول نکال لیا۔ یہ سب کتنا آسان ہے۔ اب اس کے بعد وہ کہاں جائے گا۔ وہ روح کا قاتل تھا۔ اس کی روح کہاں جائے گی۔ کیا پتا' اسے دوسرا جنم ملے اور اس جنم میں وہ نازنین کا محبوب ہو۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں۔ اس کے لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

وہ سیف بند کرنے والا تھا کہ اس کی نظر نازنین کے جیولری کیس پر پڑ گئی۔ اسے خیال آیا ...... ممکن ہے سفینہ انصار کا کہنا درست ہو۔ فرض کرو کہ مختار نے نازنین کو قتل نہیں کیا۔ اس صورت میں قاتل تو بہت خوش ہوگا اور اسے بے وقوف سمجھ رہا ہوگا کہ اس کے بیان کی وجہ سے مختار جیل میں ہے ......اور وہ محفوظ ہے۔ یہ تو زیادتی ہوگی۔

اگر غلطی ہوئی ہے تو اس کی اصلاح کا ایک طریقہ تو ہے۔ وہ سب کچھ سفینہ انصار کو دے دے۔ اگر مختار قاتل نہیں ہے تو وہ ان چیزوں کی مدد سے اصل قاتل کو تلاش کر لے گی۔

ڈاکٹر نے جیولری کیس باہر نکالا۔ پستول اس کے اوپر رکھا اور دونوں چیزوں کو اپنی اسٹڈی میں میز پر لے آیا۔ اس نے پین کھولا' ایک کاغذ لیا اور اس پر کچھ لکھنے لگا۔ رقعہ لکھنے کے بعد اس نے جیولری کیس اور رقعے کو ایک لفافے میں رکھ کر بند کیا۔ اس پر سفینہ انصار کا نام اور اس کے دفتر کا پتا تحریر کیا پھر وہ باہر نکلا اور پوسٹ آفس کی طرف چل دیا۔

رات گیارہ بجے وہ واپس آیا۔ اس نے کوٹ اتارا' پستول ہاتھ میں لیا اور بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس نے لائٹس آف کر دیں۔ صرف وہ لائٹ روشن رہنے دی' جو نازنین کی تصویر کو جگمانے کے لیے لگائی گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ رات بارہ بجے وہ اپنی اس زندگی کا خاتمہ کرے گا' جو کہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ اس خیال نے اسے خوشی اور سکون سے بھر دیا۔

ساڑھے گیاہ بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ یہ اس وقت کون آ گیا۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ اس نے گھنٹی کو نظرانداز کرنا چاہا لیکن آنے والا جو کوئی بھی تھا' وہ یوں جانے والا نہیں تھا پھر اس کی سمجھ میں آ گیا۔ ایسا پہلے بھی ہوا تھا۔ قریب کوئی ...... ایکسیڈنٹ ہوا ہوگا۔ اس نے سوچا اور کسی کو مدد کی ضرورت ہوگی۔ آخر میں ڈاکٹر ہوں۔ چلو اچھا ہے۔ جاتے جاتے کسی کے کام ہی آ جاؤں۔

اس نے دروازہ کھولا۔ گولی اس کی آنکھوں کے عین درمیان لگی ......اور وہ گرتا چلا گیا۔

☆☆☆

منگل۔ 7 نومبر!

منگل کی صبح نو بجے جعفر سعید اپنے دفتر پہنچا تو صدیقہ بیگم اور بتول پہلے ہی وہاں پہنچی ہوئی تھیں اور اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ''جعفر صاحب' مجھے افسوس ہے کہ ہم بغیر بتائے آپ کو زحمت دے رہے ہیں لیکن خالہ کل آپریشن کے لیے ہسپتال میں داخل ہو رہی ہیں۔ چند منٹ آپ سے بات کر لیں گی تو انہیں سکون مل جائے گا۔'' بتول نے معذرت کی۔

''کیوں نہیں۔ آپ اندر چلیں۔ میں کافی لے کر آتا ہوں۔'' جعفر نے خوش دلی سے کہا۔

وہ اندر جا بیٹھیں۔ جعفر کافی لے کر اندر گیا۔ صدیقہ بیگم نے کہا ''بیٹے تم ہمارے لیے جو کچھ کر رہے ہو' میں تمہیں اس کا صلہ کبھی نہیں دے سکوں گی۔''

''بیٹا کہہ دیا تو صلے کی بات کیسی۔''

''جعفر صاحب' جب سے یہ نئی امید بندھی' میں تو بہت خوش ہوں۔'' بتول نے کہا۔

''سفینہ کل ڈاکٹر سلمان سے ملی تھی۔ وہ اس ملاقات کے بارے میں بہت پرامید ہے اور دوسری طرف بھی امید افزا باتیں ہیں۔'' جعفر انہیں فواد اصغر کے گھر سے نکلنے والے ریکارڈز کے متعلق بتانے لگا ''اس سے ہمیں زیورات کے معاملے میں مدد مل سکتی ہے۔''

''میں کچھ اس وجہ سے بھی آئی ہوں۔'' صدیقہ بیگم بولیں۔ ''میں نے ایک تصویر کے متعلق بتایا تھا نا' جس میں نازنین وہ پن لگائے ہوئے ہے۔ کل زیورات کی باتیں ہوئیں تو میں نے سوچا کہ وہ تصویر تمہیں دے دوں۔ شاید کسی کام

آ جائے۔'' اس نے ایک لفافہ جعفر کی طرف بڑھایا۔

جعفر نے اس میں سے تصویر نکالی۔ وہ ایک اخبار سے کاٹی گئی چار کالمی اور بڑی تصویر تھی۔ اس میں نازنین بہت ہی حسین لگ رہی تھی اور اس کے سوئٹر پر ہیروں کی وہ جگمگاتی پھول کی شکل والی پن بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔ ''یہ وہ ڈبل پن ہے جو غائب ہوگئی تھی۔'' صدیقہ بیگم نے کہا۔

''ذرا پورا ریکارڈ سامنے آ جائے۔ میں چیک کروں گا کہ یہ پن امتیاز حیدر نے تو نہیں خریدی تھی۔''

وہ ان دونوں کو چھوڑنے دروازے تک گیا۔ ان کی امید دل چھو لینے والی تھی۔ جعفر نے دل میں دعا کی کہ وہ ان کی توقعات پر پورا اترے۔ اس نے صدیقہ بیگم کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ''اب آپ خود کو بہتر محسوس کیجیے گا۔ خدا آپریشن کامیاب فرمائے۔ انشاء اللہ آپ اس کے فوراً بعد مختار کو آزاد کرانے کے لیے جیل جائیں گے۔''

''بیٹے' اللہ رحم کرنے والا ہے۔ وہ میری ان مشقتوں اور زحمتوں کو رایگاں نہیں ہونے دے گا۔'' صدیقہ بیگم نے جاتے ہوئے کہا ''میں ننگے پاؤں جہنم میں چلی ہوں مختار کے لیے۔''

جعفر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ اہم کام نمٹانے کے بعد اس نے سفینہ کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ ضرورت ہوئی تو وہ سفینہ کو یہ اخباری تصویر فیکس کر دے گا مگر وہ جانتا تھا کہ سفینہ کی آواز سننے کی بھی اب اس کے لیے خاص اہمیت ہوگئی ہے۔

لیکن نمبر ملا تو سفینہ کی آواز میں خوف محسوس کر کے اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ ''مجھے ابھی ڈاک میں ایک پیکٹ موصول ہوا ہے' جو ڈاکٹر سلمان کا بھیجا ہوا ہے۔ اس میں نازنین کا جیولری باکس ہے اور وہ کارڈ ہے' جو پھولوں کیساتھ بھیجا گیا ہوگا۔ خط میں ڈاکٹر نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے مختار کے متعلق اور نازنین کی جیولری کے متعلق جھوٹ بولا تھا۔ خط میں لکھا ہے کہ جس وقت مجھے یہ پیکٹ ملے گا' وہ خودکشی کر چکا ہوگا۔''

''خدا کی پناہ۔ تو کیا اس نے.....؟''

''نہیں۔ ڈاکٹر نے خودکشی نہیں کی۔ ابھی صالحہ وہاب نے مجھے فون کیا تھا۔ ڈاکٹر صبح اپنے مطب نہیں پہنچا۔ فون کیا گیا تو اس نے فون بھی ریسیو نہیں کیا ......صالحہ اس کے گھر گئی۔ ڈاکٹر کی لاش اسے دروازے کے اندر چھوٹے ہال میں پڑی ملی۔ اسے شوٹ کیا گیا تھا اور کسی نے پورے گھر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ جعفر' مجھے لگتا ہے' وہ جو کوئی بھی تھا' اسے نازنین کے زیورات کی تلاش تھی۔ جعفر' کون ہے جو یہ سب کچھ کر رہا ہے؟ کیا اس کا اگلا نشانہ طوبیٰ ہوگی؟''

☆☆☆

منگل کی صبح ارشد جمال ساڑھے نو بجے سو کر اٹھا۔ اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ بس ٹانگوں اور کمر میں ذرا دکھن تھی۔ اب وہ اپنے شام نگر والے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ لیکن پہلے اسے فون کرنا تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے گھر کے باہر الیکٹرک کمپنی کی گاڑی کھڑی ہے۔ اس گاڑی میں سگنل موصول ہوا کہ ارشد جمال فون استعمال کر رہا ہے۔ محکمہ سراغ رسانی کے لوگ اس کی گفتگو سنتے اور ایک دوسرے کو فاتحانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان میں سے ایک نے کہا ''اب وہ ہمیں اپنے خفیہ ٹھکانے تک پہنچائے گا۔''

ارشد جمال نے شام نگر کے ایک جنرل اسٹور کو فون کیا تھا اور ضرورت کی تمام چیزوں کا آرڈر نوٹ کرایا تھا۔ اس نے آخر میں کہا۔ ''میں ایک بجے تک پہنچوں گا۔''

☆☆☆

اظہر عباس ایک کیس پر کام کر رہا تھا اور اس میں بہت مصروف تھا۔ دوپہر کے وقت سفینہ کو اس سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے اسے ڈاکٹر کے قتل اور اس کے بھیجے ہوئے پیکٹ کے بارے میں بتایا۔ اب وہ خود کو پوری طرح سنبھال چکی تھی اور مطمئن تھی کیونکہ یونس نصیر اس وقت طوبیٰ کے اسکول کے باہر موجود تھا۔ وہ اسے اپنی گاڑی میں گھر لے کر جاتا۔

اظہر نے جیولری باکس کی چیزوں کا جائزہ لیا اور ہر چیز کو ڈاکٹر کے خط میں

موجود فہرست سے ملا کر دیکھا "یہ برج جدی والا بریسلیٹ بھی موجود ہے۔" اس نے کہا "اور ہیرے اور زمرد کی یہ دل کی شکل کی انگوٹھی بھی ......واہ......واہ بڑے خوب صورت زیورات ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہ تو نازنین قتل کے وقت پہنے ہوئے تھی لیکن ایک پھول کی شکل کی ڈبل پن ہے۔ ڈاکٹر نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ اس کے پاس ہوگی بھی نہیں۔ ابھی جعفر نے مجھے نازنین کی ایک اخباری تصویر فیکس کی ہے۔ اس میں نازنین وہ پن لگائے ہوئے ہے۔ وہ پن گھر میں موجود ہی نہیں تھی۔ آپ دیکھیں' وہ پن اس قدیم بریسلیٹ سے کتنا ملتی ہے۔"

سفینہ نے پن والی تصویر کو غور سے دیکھا۔ اسے دیکھ کر ماں اور بچے کا خیال آتا تھا۔ صدیقہ بیگم نے بتایا تھا کہ پن دو حصوں میں ہے۔ بڑا حصہ پھول کی شکل کا ہے اور چھوٹا ادھ کھلی کلی کی شکل کا۔ ایک نازک زنجیر دونوں حصوں کو آپس میں ملاتی تھی۔ سفینہ اسے دیکھتی رہی۔ اسے تعجب ہوا کہ وہ اسے جانی پہچانی ......بہت بار کی دیکھی ہوئی لگ رہی تھی۔ "ہم دیکھیں گے کہ امتیاز کی زیورات کی رسیدوں میں اس پن کا تذکرہ بھی ہے یا نہیں۔" اظہر عباس نے کہا۔ "اب سیدھی سی بات یہ ہے کہ اس پن کو چھوڑ کر دوسرے تمام زیورات جو ڈاکٹر نے بھیجے ہیں اور اس کی فہرست میں موجود ہیں' وہ ہیں جو دوسرے مردوں کے دیے ہوئے تھے اور نازنین کے کہنے پر ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کے دیے ہوئے ہیں۔"

"ڈاکٹر نے خط میں جو لکھا ہے' وہ مختار عظیم کے بیان کی پوری طرح تائید کرتا ہے۔" اظہر نے ڈاکٹر کے خط کو ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا "سفینہ' کل تم ڈاکٹر سے ملی تھیں تو کسی نے تمہارا تعاقب تو نہیں کیا تھا۔"

"اب تو میں سوچ رہی ہوں کہ ضرور کسی نے میرا تعاقب کیا ہوگا۔" سفینہ بولی "اسی لیے تو مجھے طوبیٰ کی طرف سے فکر ہو رہی ہے۔"

"میں تمہارے گھر کے باہر پہرے کا بندوبست کرا دوں گا لیکن اس سے بھی بہتر یہ ہوگا کہ تم اور طوبیٰ یہ معاملہ نمٹنے تک کسی زیادہ محفوظ جگہ رہ لو۔ اس وقت امتیاز حیدر کسی گھرے ہوئے بھیڑیے کی طرح خوں خوار ہو رہا ہوگا۔ وہ کارڈ اور کوئی زیور

اگر اس سے متعلق ثابت ہوگا تو نازنین مرڈر کیس کا تو نقشہ ہی بدل جائے گا کیونکہ کارڈ پر اس کی تحریر تو ثابت ہو جائے گی۔ وہ چاہے ٹیکس کے کیس سے بچ نکلے لیکن قتل کے کیس میں پھنس جائے گا۔"

"تو مختار عظیم کے بری ہونے کا امکان ہے۔"

"اگر صورت حال وہی ہے جو نظر آ رہی ہے تو میں خود اس کے لیے سفارش کروں گا۔" اظہر نے کہا۔

"لیکن اظہر صاحب' اب ارشد جمال کے اینگل کو بھی دیکھنا پڑے گا۔" سفینہ نے جو کچھ تمکنت اکبر سے سنا تھا' اسے بتایا "وہ کہتی ہیں کہ ارشد جمال نوادرات کا چور ہے۔ تو یہ عین ممکن ہے کہ نازنین کا قاتل بھی وہی ہو اور وہی قیمتی چیزیں بھی لے اڑا ہو۔"

"یہ ضروری تو نہیں۔"

"ہاں' ضروری تو نہیں ہے۔"

"دیکھو ...... میں ابھی محکمہ سراغ رسانی سے وہ پمفلٹ منگواتا ہوں۔" اظہر نے انٹرکوم کا بٹن دباتے ہوئے کہا "پہلے یہ معلوم کرلوں کہ اس کیس کا انچارج کون ہے۔"

پانچ منٹ کے اندر پمفلٹ ان کے پاس پہنچ گیا۔ اظہر نے اپنی سیکرٹری سے پمفلٹ پر دیا گیا نمبر ملانے کو کہا "مجھے انچارج سے بات کرنی ہے۔" اس نے کہا۔

مزید ایک منٹ بعد اظہر عباس انسپکٹر محسن سے بات کر رہا تھا۔ اس نے اسپیکر فون آن کر دیا تھا تاکہ سفینہ بھی گفتگو سن سکے "مسٹر محسن' یہ بات بہت اہم ہے۔ تم اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ ایک تصویر فریم تلاش کریں۔ وہ نیلے رنگ کا موتیوں سے جڑا ہوا فریم ہے۔ ممکن ہے' اس میں ایک بہت خوب صورت عورت کی تصویر بھی ہو۔ اگر وہ فریم ارشد جمال کے گھر سے ملتا ہے تو پھر ممکن ہے کہ وہ ایک اور قتل میں بھی ملوث ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اپنے ماتحتوں کو الرٹ کردوں گا اور آپ کو باخبر رکھوں

گا۔''

ریسیور رکھ کر اظہر نے سفینہ کو گھورا ''یہ فریم کا کیا چکر ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اس نے صرف سفینہ کے کہنے پر یہ بات کی تھی۔

''اس فریم کے متعلق مجھے مختار نے بتایا تھا۔ وہ حلف اٹھانے کے لیے تیار ہے کہ قتل والی صبح وہ فریم اس کے بیڈروم میں نائٹ ٹیبل پر موجود تھا لیکن قتل کے بعد اس نے دیکھا تو وہ موجود نہیں تھا۔'' سفینہ نے کہا اور نازنین کی اخباری تصویر کو جھک کر دیکھا۔ اس تصویر میں نازنین وہ پن لگائے ہوئے تھی ''کیسی عجیب بات ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسی پن میں نے پہلے کہیں دیکھی ہے ...... میرا مطلب ہے بڑی پن سے جڑی ہوئی چھوٹی پن۔'' اس نے تصویر کو ایک طرف ہٹا دیا۔ ''اظہر صاحب' ارشد جمال نے نازنین کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ اب ہم فرض کرلیں کہ وہ بھی نازنین کی محبت میں گرفتار ہوگیا اور اس نے نازنین کو یہ قدیم پن اور بریسلیٹ دیا۔ نوادرات اور شہ پاروں کا ماہر ہونے کی حیثیت سے وہ اسی طرح کی چیزیں پسند کرسکتا تھا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ نازنین امتیاز حیدر کے ساتھ بھی کھیل رہی ہے۔ تو ممکن ہے کہ وہ اس رات نازنین سے ملنے آیا ہو اور اس نے وہ پھول اور امتیاز کا بھیجا ہوا وہ کارڈ دیکھا ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے' اس نے نازنین کو قتل کیا اور یہ پن لے گیا۔''

''پن اور تصویری فریم بھی۔ مختار کی ماں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ فریم بہت خوب صورت تھا۔''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے بریسلیٹ کیوں چھوڑ دیا۔''

''آج جب میں آپ سے ملاقات کا انتظار کررہی تھی تو میں نے لاش کی وہ تصویریں دیکھیں جو لاش ہٹانے سے پہلے لی گئی تھیں۔ نازنین کے بائیں ہاتھ میں سونے کا بریسلیٹ تھا' جو تصویر میں بھی نظر آرہا ہے اور ہیروں والا بریسلیٹ سیدھے ہاتھ میں تھا۔ وہ تصویر میں نظر نہیں آرہا ہے۔ میں نے ریکارڈ چیک کیا۔ وہ بریسلیٹ ذرا ڈھیلا تھا۔ نازنین نے اسے اوپر تک چڑھا لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ قاتل بریسلیٹ واپس لینے کے لیے آیا ہے اور اسی لیے قاتل کو

بریسلیٹ کی موجودگی کا پتا نہیں چلا۔''

انہیں محسن کی کال کا انتظار تھا۔ اس دوران انہوں نے خود ایک پمفلٹ ترتیب دے ڈالا۔ اس میں ان زیورات کی تصویریں دی جانی تھیں' جن کی انہیں جستجو تھی اور انہوں نے سوچا تھا کہ یہ پمفلٹ شہر کی ہر جیولری کی دکان پر بھیجا جائے گا۔

اچانک اظہر نے کہا ''سفینہ' ذرا یہ تو سوچو۔ ہمارے کونسلر شاہ زیب کی بیوی کی مدد سے رکن قومی اسمبلی قمر جاوید کی ماں کا قاتل پکڑا جائے گا اور اگر ارشد جمال نازنین کے قتل کیس میں بھی پھنس گیا تو......''

لو شروع ہوگئی سیاست۔ سفینہ نے سوچا۔ میئر کے عہدے کا امیدوار سیاسی فائدوں پر غور کررہا ہے۔ اب وہ یہ بھی سوچے گا کہ ایک بے قصور انسان کو سزا دلوانے کی زیادتی کو کس طرح الٹا اپنے حق میں استعمال کیا جائے لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

☆☆☆

ارشد کی ملازمہ شہناز کو علم نہیں تھا کہ جب وہ سودا لینے کے لیے جنرل اسٹور پر رکی تو ایک کار اس کا تعاقب کررہی تھی پھر وہ اس شخص کے گھر گئی جسے وہ نبیل غوری کے نام سے جانتی تھی' تب بھی کار اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

اس کے پاس چابی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ دس منٹ بعد اطلاعی گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس مکان کے قریب تو کوئی پھٹکتا بھی نہیں تھا اور نبیل صاحب کا حکم تھا کہ وہ گھر میں کسی کو نہیں گھسنے دے گی۔

سو شہناز نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باہر صاف ستھرا لباس پہنے ایک شخص کھڑا تھا وہ چہرے بشرے سے معقول آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے شہناز کو دیکھا تو اپنی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ اس کا تعلق محکمہ سراغ رسانی سے تھا۔

''محترمہ' آپ دروازہ کھولیں۔ تاکہ میں آپ سے بات کرسکوں۔'' اس شخص نے کہا۔

شہناز نروس ہوگئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

''محترمہ میرا نام متین ہے۔ میں آپ سے ارشد جمال کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مگر میں کسی ارشد جمال کو نہیں جانتی۔''

''تو یہ مکان کس کا ہے؟''

''یہ تو نبیل غوری صاحب کا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں نبیل غوری بن کر رہتا ہے۔ بہر حال آپ اس کی گھریلو ملازمہ ہیں نا؟''

''جی ہاں۔''

''آپ یہاں کب سے کام کر رہی ہیں؟''

''کئی برس ہوگئے۔''

''جی ہاں۔ انہوں نے مجھے فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ وہ ایک بجے یہاں پہنچیں گے اور جناب ان کا حکم ہے کہ میں کسی کو گھر میں داخل نہ ہونے دوں۔''

''میں گھر میں آنا بھی نہیں چاہتا۔ میرے پاس سرچ وارنٹ نہیں ہے مگر میں آپ سے ایک بات تو کرسکتا ہوں۔ یہ آپ کے نبیل غوری جو ہیں ان کا اصل نام ارشد جمال ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ وہ چوری کی کئی وارداتیں کر چکا ہے۔ وہ نوادرات اور آرٹ پیس چراتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قتل میں بھی ملوث ہو۔''

''خدایا۔'' شہناز کی سانس پھولنے لگی۔ اسے نبیل غوری پراسرار تو لگتا تھا۔ وہ یہاں ہمیشہ اکیلا آتا تھا لیکن ایسا تو ہوتا ہے۔ بہت مصروف اور امیر لوگ پہاڑی علاقوں میں مکان خرید لیتے ہیں اور جب شہری زندگی کی دوڑ میں تھک جاتے ہیں تو سکون کی غرض سے وہاں آتے ہیں لیکن یہ اتنے بڑے چکر...... تو وہ مجرم ہے۔

متین نے اسے چوری کی کئی چیزوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا ''وہ بہت قیمتی چیزیں چراتا ہے۔'' اس نے آخر میں کہا۔

''جناب یہ چیزیں اس گھر میں موجود ہیں۔'' شہناز نے افسردگی سے کہا۔

''اور ایک نیلے رنگ کا فریم ہے' جس پر سونے کا بارڈر ہے اور سچے موتی

جڑے ہوئے ہیں۔ اس میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر بھی ہے۔''

''جی ہاں۔ وہ ان کے بیڈ روم میں نائٹ ٹیبل پر رکھا ہے۔''

''محترمہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ آپ کی پوزیشن کلیئر ہے۔ آپ کو صورت حال کا علم ہی نہیں ہوگا مگر آپ کو ہم سے تعاون کرنا ہے۔ ہمیں آپ کا بیان چاہیے اور اب ہم سرچ وارنٹ بھی منگوائیں گے۔ تاکہ مکان کی تلاشی لیں اور ارشد جمال کو گرفتار کرلیں۔''

کیپٹن متین اسے لے کر پولیس کی گاڑی کی طرف چل دیا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔'' شہناز نے پریشان ہو کر کہا ''مجھے علم نہیں تھا۔''

☆☆☆

انسپکٹر محسن کی کال آنے کے بعد سفینہ اپنے آفس میں واپس آگئی۔ اب اسے یقین ہوگیا تھا کہ ارشد جمال کسی نہ کسی طور نازنین کے قتل میں ملوث ہے۔ کیسے اور کس حد تک۔ اس کا پتا اسی وقت چل سکتا تھا' جب اس کی گرفتاری کے بعد اسے اس سے بات کرنے کا موقع ملتا۔

اس کی میز پر پیغامات کا انبار تھا۔ شاہ زیب اکبر کے پیغام پر ارجنٹ لکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً انہیں فون کیا۔

''کال بیک کرنے کا شکریہ سفینہ'' شاہ زیب نے کہا ''میں اسی طرف آرہا ہوں۔ تم آج لنچ میرے ساتھ کرو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

پچھلے کچھ عرصہ سے شاہ زیب انکل اسے جج کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے لیکن آج انہوں نے اسے جج نہیں کہا اور یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ سفینہ جانتی تھی کہ وہ کھرے آدمی ہیں۔ جو ہے سو ہے۔ اگر اس کی تفتیش کے نتیجے میں اظہر عباس کو سیاسی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی نامزدگی بھی ختم۔ چاہے وہ درست ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہے سیدھی سی حقیقت۔

''ٹھیک ہے انکل۔'' اس نے کہا۔

''ڈیڑھ بجے سولاری میں پہنچ جانا۔''

سفینہ جانتی تھی کہ شاہ زیب نے کیوں فون کیا ہے۔ انہیں ڈاکٹر سلمان کی

موت کا پتا چل گیا ہوگا اور اس کی اور طوبیٰ کی طرف سے فکر مند ہوں گے۔

اس نے جعفر کے دفتر فون کیا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا۔ سفینہ نے ارشد جمال کے متعلق بتایا۔

''مجھے خوشی ہے کہ معاملات ٹھیک ہوتے جا رہے ہیں۔'' جعفر نے کہا۔

''محکمہ سراغ رسانی والے ارشد جمال کے گھر سے ملنے والی ہر چیز کی تصویر کھینچیں گے اور کیٹلاگ بنائیں گے۔ میں اور اظہر وہاں ارشد سے تفتیش کے لیے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ صدیقہ بیگم بھی ہمارے ساتھ ہوں۔ تاکہ وہ تصویری فریم شناخت کرلیں۔ ہاں تم نے مختار کو فون کر کے ڈاکٹر سلمان کے خط کے بارے میں بتایا؟''

''ہاں وہ رونے لگا یہ سن کر۔ مجھے بھی رونا آ گیا تھا۔'' جعفر کی آواز بھرا گئی ''سفینہ وہ آزاد ہونے والا ہے......اور صرف تمہاری وجہ سے۔''

''نہیں تمہاری اور طوبیٰ کی وجہ سے ورنہ میں نے تو اس کیس سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔''

''خیر اس پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی دوسرے فون پر صدیقہ بیگم کی کال ہے۔ وہ کل بائی پاس کے لیے ہسپتال میں داخل ہو رہی تھیں۔ میں انہیں کہوں گا کہ فی الحال ارادہ ملتوی کر دیں......بس چند دنوں کے لیے۔ تم سے میں بات بعد میں کروں گا سفینہ اور ہاں میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اور طوبیٰ آج رات گھر میں اکیلی رہو۔ اچھا خدا حافظ۔''

شاہ زیب سے ملاقات کے لیے نکلنے سے پہلے سفینہ نے یونس نصیر کو اس کے سیلولر پر فون کیا۔ اس نے پہلی گھنٹی میں جواب دیا ''یونس اسپیکنگ!''

''میں سفینہ بول رہی ہوں یونس۔''

''ابھی وقفہ ختم ہوا ہے۔ طوبیٰ اندر گئی ہے۔ میں نے گاڑی اسکول کے گیٹ کے سامنے کھڑی کی ہے۔ چھٹی کے بعد میں اسے گھر لے جاؤں گا اور اس کے اور آیا کے ساتھ رہوں گا۔ تم فکر نہ کرو سفینہ۔ میں تمہاری بچی کا پوری طرح خیال رکھوں گا۔''

''میں جانتی ہوں یونس۔ شکریہ۔ خدا حافظ۔''

اب اسے شاہ زیب انکل سے ملنا تھا۔ پر ہجوم کاریڈور سے گزرتی وہ لفٹ کی طرف بڑھی۔ لفٹ کا دروازہ بند ہو ہی رہا تھا کہ وہ اس میں گھس گئی۔ اس تمام وقت میں وہ گمشدہ پن کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ وہ اسے جانی پہچانی کیوں لگ رہی تھی۔ دو حصے......پھول اور کلی جیسے ماں اور بیٹی۔ یہ مجھے جانی پہچانی بات لگتی ہے۔ کیوں؟

شاہ زیب ریسٹورنٹ میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ انہوں نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا ''تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو بیٹی۔ وہ بولے۔ ''کیا بہت دباؤ ہے تم پر۔''

وہ جب بھی اس طرح بات کرتے' سفینہ کے دل میں شکر گزاری کی ایک لہر اٹھتی تھی۔ شاہ زیب اس کے لیے سچ مچ باپ کی طرح تھے ''ابھی تک یہ بہت تھکا دینے والا اور مصروف دن ثابت ہو رہا تھا۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا ''آپ کو ڈاکٹر سلمان کا پتا چلا؟''

''ہاں۔ تمکنت نے فون کر کے بتایا۔ اس نے خبریں سنی تھیں۔ مجھے تو یہ بھی امتیاز حیدر کا کام لگتا ہے۔ میں اور تمکنت طوبیٰ کی طرف سے پریشان ہیں۔''

''میں بھی ہوں۔ میرے ڈیپارٹمنٹ کا ایک آدمی اس کے پاس ہے۔''

ویٹر ان کی طرف چلا آیا ''آپ آرڈر لکھوا دیں پھر میں آپ کو کچھ بتاؤں گی۔'' سفینہ نے کہا۔

''تم بتاؤ کیا کھاؤ گی؟''

''میرے لیے تو سبزی پلاؤ منگوا لیں۔ ساتھ میں شامی کباب۔''

''واہ......سبزی کی تلافی شامی کباب سے۔ اچھی ترکیب ہے۔''

شاہ زیب ہنسنے لگے پھر انہوں نے ویٹر کو آرڈر نوٹ کرا دیا۔

سفینہ نے شاہ زیب کو ڈاکٹر کے بھیجے ہوئے نازنین کے جیولری باکس اور اس کے خط کے متعلق بتایا۔

''میں شرمندہ ہوں کہ میں تمہارا دھیان اس کیس سے ہٹانا چاہتا تھا۔'' شاہ

زیب نے کہا" میں تمہاری نامزدگی کے لیے کوشش کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا لیکن گورنر صاحب نے کہہ دیا ہے کہ اگر اظہر عباس کا الیکشن خطرے میں پڑا تو وہ تمہیں ہرگز نامزد نہیں کریں گے۔"

"چلیں امید تو ہے۔ ارے ہاں آنٹی نے تو بڑا کام کیا۔ ایک مجرم پکڑوا دیا۔" وہ شاہ زیب کو ارشد جمال کے متعلق بتانے لگی۔" اظہر صاحب تو یہ اعلان کرنے کے لیے بے چین ہیں کہ رکن اسمبلی قمر جاوید کی ماں کے قتل کو شہر کے سماجی رہنما اور کونسلر شاہ زیب اکبر کی اہلیہ کی مدد سے گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ آپ سے اپنی دوستی اور تعلق کو ایکسپلائٹ کریں گے مگر اس میں ان کا بھی قصور نہیں۔ آپ شہر کے سب سے محترم سیاست دان ہیں۔"

شاہ زیب مسکرائے" سچ کو ہمیشہ تھوڑا سا پھیلایا جا سکتا ہے۔ تمکنت اگر یہ کہے کہ اس نے پہلے اظہر عباس سے بات کی تھی اس سلسلے میں اور اظہر نے اسے محکمہ سراغ رسانی سے رابطے کا مشورہ دیا تھا۔" پھر اچانک اس کی مسکراہٹ ہوا ہو گئی" سفینہ اس بات کا امکان تو نہیں کہ طوبیٰ کی تصویر ارشد جمال نے کھینچی ہو۔"

"نہیں۔ خود وقاص نے تصدیق کی تھی کہ وہ امتیاز کی حرکت ہے اور میرے لیے دھمکی ہے۔"

"اب اگلا قدم کیا ہوگا؟"

"میں اور اظہر صدیقہ بیگم کو ساتھ لے کر ارشد جمال کے خفیہ ٹھکانے پر جائیں گے۔ وہاں صدیقہ بیگم اس فریم کی شناخت کریں گی۔ ارشد کو فی الحال شام نگر جیل میں رکھا جائے گا پھر مسروقہ آئٹمز کی شناخت ہوتی رہے گی لیکن وہ اس وقت سب سے پہلے اس پر قمر جاوید کی والدہ کا قتل لادنا چاہ رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ نازنین کے قتل میں ملوث ثابت ہو۔"

"اگر وہ زبان نہ کھولے تو؟"

"ہم نے پمفلٹ تیار کیا ہے جو ہم شہر کے تمام جیولرز کو بھیجیں گے۔ مجھے امید ہے کہ کچھ خاص قسم کی جیولری کی شناخت ہو جائے گی اور اگر امتیاز حیدر خریدار ثابت ہوا تو کام آسان ہو جائے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ قدیم اور نادر ہیروں کا

بریسلیٹ نازنین کو ارشد جمال نے دیا ہوگا۔ وہ ایسا غیر معمولی زیور ہے کہ جس نے بیچا ہوگا وہ اسے ضرور شناخت کر لے گا۔"

"تو تمہارا کل صبح شام نگر جانے کا پروگرام ہے؟"

"جی ہاں اور میں طوبیٰ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی۔ اس لیے یونس سے مدد لینی ہوگی۔"

"اس سے بہتر ہے کہ تم طوبیٰ کو آج رات ہمارے ہاں چھوڑ دو۔ ہمارا سیکیورٹی کا نظام بہت اچھا ہے۔ یہ تم جانتی ہو۔ میں بھی وہاں موجود ہوں گا اور تمہیں شاید معلوم ہو کہ تمکنت اب بھی اپنی نائٹ ٹیبل کی دراز میں ریوالور رکھتی ہے۔ برسوں پہلے میں نے اسے ریوالور استعمال کرنا سکھایا تھا اور ویسے بھی طوبیٰ کی موجودگی تمکنت کے لیے فائدہ مند ہوگی۔ آج کل تمکنت کی طبیعت خراب چل رہی ہے۔ طوبیٰ سے اس کا دل بہل جائے گا۔"

سفینہ مسکرائی" اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔ ٹھیک ہے انکل۔ اس طرح مجھے بھی وقت مل جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ ارشد جمال سے پوچھ گچھ کرنے سے پہلے میں نازنین کیس کی فائل کو ازبر کر لوں۔ طوبیٰ آپ لوگوں کے پاس بہت خوش رہتی ہے۔ اسے آپ کا گلابی گیسٹ روم بہت اچھا لگتا ہے۔"

"یاد ہے۔ وہ تمہارا کمرہ تھا۔"

"یاد ہے۔ بھول کیسے سکتی ہوں۔"

☆☆☆

ارشد جمال کو اپنے شام نگر والے مکان میں قدم رکھتے ہی کسی بے حد خوفناک گڑ بڑ کا احساس ہو گیا۔ اس کی ملازمہ شہناز موجود نہیں تھی۔ حالانکہ اسے موجود ہونا چاہیے تھا اور اس نے کوئی معذرتی رقعہ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جا چکا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے یہی بتا رہی تھی۔

اسے بھوک کا احساس ہونے لگا۔ اس نے فریج کھول کر اس کا جائزہ لیا اس نے انڈے فرائی کیے اور اپنے لیے سینڈوچ بنائے۔ سینڈوچ لے کر وہ پورے گھر کا جائزہ لیتا پھرا۔ وہ حساب لگا رہا تھا کہ یہاں موجود چیزوں کی کتنی مالیت ہے۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ایک وکیل کی ضرورت پڑے گی۔ بہت اچھے وکیل کی۔ اس کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ ابھری۔ جعفر سعید! ہاں' جعفر سعید ایسا وکیل تھا' جو سزا ہو جانے کے باوجود دس سال سے اپنے موکل کی رہائی کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہا تھا اور جعفر اس کا کیس لینے پر رضامند بھی ہو جائے گا کیونکہ وہ اس کے موکل کی بے گناہی ثابت کر سکتا ہے۔ اس کی شہادت مختار عظیم کو رہائی دلوا سکتی ہے۔

اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ گھنٹی پھر بجی......اور بجتی ہی چلی گئی پھر عقبی دروازے کی اطلاعی گھنٹی بھی بجائی جانے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ مکان کو چاروں طرف سے گھرا جا چکا ہے کوئی بات نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہے۔ اس نے پچھلے ہفتے اپنی چھٹی حس کی بات مان لی ہوتی اور ملک سے نکل گیا ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

وہ پانی پینے کے لیے کچن میں گیا۔ کھڑکیوں میں چہرے ہی چہرے تھے۔ مطمئن چہرے۔ اس نے انہیں دیکھ کر تمسخر سے سر ہلایا اور گلاس ان کی طرف بڑھایا' جیسے انہیں پانی پیش کر رہا ہو پھر وہ عقبی دروازے کی طرف گیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ وہ سب اندر گھس آئے "مسٹر ارشد جمال' محکمہ سراغ رسانی۔" ان میں سے ایک نے کہا "ہمارے پاس سرچ وارنٹ موجود ہے۔"

"میری درخواست ہے کہ احتیاط سے چلیے گا۔ یہاں بہت نازک اور قیمتی چیزیں ہیں۔" اس نے کہا۔

☆☆☆

سفینہ نے ساڑھے تین بجے طوبیٰ کو فون کیا۔ طوبیٰ کے ساتھ آیا موجود تھی اور وہ کمپیوٹر پر گیمز کھیل رہی تھی۔ سفینہ نے اسے پروگرام بتایا "بیٹا' مجھے آج دیر تک کام کرنا ہے اور صبح سات بجے شام نگر کے لیے روانہ ہونا ہے۔ انکل شاہ زیب اور آنٹی چاہتے ہیں کہ آج تم ان کے ساتھ رہو۔ یوں میں بھی تمہاری طرف سے مطمئن رہوں گی۔"

طوبیٰ خوش ہو گئی "واہ......وہاں میں نانی کی پرانی البم بھی ضرور دیکھوں

گی۔" اس نے کہا "مجھے پرانے فیشن کے کپڑے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ ہماری کیمرا کلاس میں اگلا کام فیملی البم بنانے کا ہے۔"

"ہاں۔ ان کے پاس پرانی تصویریں بہت زیادہ ہیں۔ میں جب وہاں جاتی تھی تو ہمیشہ ان کے ملازم گنا کرتی تھی۔ اب بھی میں انہیں یاد کرتی ہوں۔"

طوبیٰ کھلکھلا کر ہنس دی "ممی آپ کی لاٹری نکل آئی تو آپ بھی ان کی طرح رہ سکیں گی۔ آپ کے بھی بہت سارے ملازم ہوں گے۔ ٹھیک ہے مما۔"

"ٹھیک ہے گڑیا۔" سفینہ نے فون رکھ دیا۔

ساڑھے پانچ بجے جعفر نے اپنے موبائل سے اسے فون کیا "تمہیں پتا ہے۔ ارشد جمال فوری طور پر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔" اس کے لہجے میں سنسنی تھی "وہ چاہتا ہے کہ اس کا کیس میں لڑوں۔"

"تو کیا تم اس کا کیس لے لو گے؟"

"یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ نازنین کیس میں بھی ملوث ہے اور اگر یہ ممکن ہوتا' تب بھی میں اس کا کیس نہ لیتا۔ میں نے یہ اس سے کہہ بھی دیا مگر وہ پھر بھی مصر ہے کہ میں اس سے مل ضرور لوں۔"

"جعفر' اسے ایسی کوئی بات نہ کہنے دینا' جو وکیل موکل تعلق کے حوالے سے راز داری کی متقاضی ہو' جو تم کسی کو بتا نہ سکو۔"

"شکریہ سفینہ۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔" جعفر نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

سفینہ بھی ہنسنے لگی پھر اس نے جعفر کو بتایا کہ اس نے طوبیٰ کے لیے بندوبست کیا ہے۔

"ٹھیک ہے سفینہ۔ میں ارشد جمال سے بات ہوتے ہی تمہیں اطلاع دوں گا۔ خدا حافظ۔"

☆☆☆

سفینہ نے دس بجے کام نمٹایا اور آفس سے نکلی۔ اس وقت تک آفس سنسان ہو چکا تھا۔ وہ نازنین کے قتل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مختار نے بتایا تھا کہ وہ

گھر سے ساڑھے چھ بجے نکلا تھا اور اس وقت نازنین زندہ تھی۔ دوسری طرف ڈاکٹر سلمان ساڑھے نو بجے پہنچا تو نازنین قتل ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ قاتل ایسا شخص تھا' جو ساڑھے چھ بجے اور ساڑھے نو بجے کے درمیان نازنین کے گھر پہنچا تھا۔ اب وہ کون ہو سکتا ہے؟ ارشد جمال؟ امتیاز حیدر؟ بہر حال بات گھوم پھر کر جیولری پر ہی آ جاتی تھی۔ اگر وہ یہ ثابت کر دیتی کہ ارشد نے نازنین کو کچھ قدیم اور نادر زیورات دیے تو ارشد یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے اور نازنین کے درمیان صرف دوستانہ تعلقات تھے۔

سفینہ کو اچانک ہی بھوک کا احساس ہوا اور بہت شدت سے ہوا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں چلی گئی۔ وہاں کھانا کھاتے ہوئے اسے طوبیٰ بڑی شدت سے یاد آئی۔ جو کچھ وہ کھا رہی تھی' وہ سب طوبیٰ کے لیے بے حد پسندیدہ تھا۔ سفینہ' طوبیٰ کو مس کر رہی تھی۔ میری بچی۔

ماں اور بیٹی...... ماں اور بیٹی!

نجانے کیوں یہ دو لفظ اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ کوئی بات تھی...... کوئی گڑ بڑ...... بہت بڑی گڑ بڑ لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے دفتر فون کر کے طوبیٰ کو خدا حافظ کہنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کیوں' اسے یہ خیال ہی نہیں آیا۔

وہ کھانا کھا کر نکلی اور اپنی کار میں آ بیٹھی۔ اس وقت گیارہ بجنے میں بیس منٹ تھے اس نے سوچا ابھی اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی کام کر سکتی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے سیلولر فون پر کال موصول ہوئی۔

دوسری طرف شاہ زیب اکبر تھا ''سفینہ۔'' اس کی آواز بہت دھیمی تھی اور اس میں کھنچاؤ بہت واضح تھا ''طوبیٰ'' تمکنت کے پاس ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ میں تمہیں فون کر رہا ہوں۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں تمہیں پریشانی میں مبتلا کروں لیکن طوبیٰ سوئی تھی...... اس نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا۔ میرا خیال ہے' تمہیں یہاں آ جانا چاہیے۔ یہاں بہت کچھ ہو رہا ہے اور طوبیٰ کو تمہاری ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے انکل۔ میں آ رہی ہوں۔'' سفینہ نے کہا۔

☆☆☆

سفر دشوار ہو گیا تھا۔ اچانک ہی برف جیسی سرد بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں کار تیز رفتاری سے چلانا ممکن نہیں رہا تھا۔ جعفر سعید کو شام نگر کے پولیس اسٹیشن پہنچتے پہنچتے پونے دس بج گئے۔ وہاں ارشد جمال حوالات میں بند تھا۔

جعفر' ارشد جمال کو تقریباً گیارہ برس کے بعد دیکھ رہا تھا۔ نازنین کے قتل کے مقدمے کے بعد سے اب تک اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں صحت مند لگ رہا تھا۔ اس کا استخوانی چہرہ اب بھر گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے تھکن کی لکیریں تھیں۔ لباس وہ بہت قیمتی پہنے ہوئے تھا' جو اس کی خوش حالی کا مظہر تھا۔ ظاہر ہے' ایک کامیاب چور خوش حال زندگی گزارتا ہے۔ اس نے سوچا۔

''مجھے خوشی ہے جعفر صاحب کہ آپ مجھ سے ملنے کے لیے آ گئے۔'' ارشد نے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیوں آیا ہوں'' جعفر بولا ''میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تم کیونکہ نازنین کیس میں بھی ملوث ہو اور مختار عظیم میرا موکل ہے۔ اس لیے میں تمہارا کیس نہیں لے سکتا۔ اب میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کو جو کچھ تم مجھے بتاؤ گے' میں اسے راز رکھنے کا پابند نہیں ہوں کیونکہ تم میرے موکل نہیں ہو۔ جو کچھ تم مجھے بتاؤ گے' میں پروسیکیوٹر کو بتا دوں گا کیونکہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش ضرور کروں گا کہ نازنین کے قتل کی رات تم اس کے گھر میں موجود تھے۔''

''میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

جعفر نے انسپکٹر محسن سے بات کی۔ محسن نے کہا'' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

چنانچہ ان دونوں کو تھانے کے کانفرنس روم میں تنہا ملنے کا موقع دیا گیا ''ہاں' اب بولو۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں اس رات نازنین کے گھر میں تھا۔'' ارشد نے کہا ''اس لیے تمہیں زحمت دی ہے۔ میں مختار کے حق میں شہادت دوں گا لیکن اس کے بدلے میں مجھے کچھ چاہیے۔''

''کھل کر بات کرو۔''

''میں چاہتا ہوں کہ مختار کے بری ہونے کے بعد تم میرا کیس لے لو۔ تب تو مفادات کا ٹکراؤ بھی نہیں ہوگا۔''

''دیکھو میں دس سال سے ایک بے قصور شخص کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں' جو ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا ہے۔ اگر تم نے نازنین کو قتل کیا یا اس کے قاتل سے واقف ہو تو تم نے دس سال بے قصور مختار کو جیل میں سڑنے دیا۔ یہ بے ضمیری ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا گوارا نہیں کرسکتا۔ یہ تو اپنے لیے جہنم کمانے کے برابر ہے۔''

''تمہاری یہی خوبیاں تو مجھے پسند ہیں۔ تمہارا استقلال' تمہاری سچائی۔'' ارشد نے آہ بھر کے کہا'' خیر' میرا نصیب مگر تم میری اتنی مدد تو کرسکتے ہو کہ میرے لیے کسی بہت اچھے وکیل کا بندوبست کر دو۔ تم تو اس فیلڈ میں بہت سے اہل وکیلوں کو جانتے ہو گے۔ فیس کی طرف سے فکر نہ کرنا اور تمہارے اس احسان کے بدلے میں تمہیں نازنین کے قتل کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں' بتا دوں گا۔ اس سلسلے میں میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔''

جعفر تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔'' ٹھیک ہے لیکن تمہیں تحریری طور پر بیان دینا ہوگا اور مجھے تم یہ تحریر بھی دو گے کہ میں مختار کی مدد کرنے کے لیے اس بیان کو عدالت میں استعمال کرسکتا ہوں۔''

''میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

ارشد جمال نے بیان لکھوایا۔ ایک اسٹینو نے اسے ٹائپ کیا۔ ارشد نے اور دو گواہوں نے اس پر دستخط کیے'' اب بتاؤ میرے لیے کوئی وکیل منتخب کیا تم نے؟'' ارشد نے جعفر سے پوچھا۔

''ہاں۔ نعیم رضوی بلاشبہ بہت اچھا وکیل ہے اور اپنے موکل کے لیے رعایتیں حاصل کرنے میں اس کا جواب نہیں۔'' جعفر نے کہا۔

''یہ لوگ مجھ پر قمر جاوید کی ماں کے قتل کا الزام بھی تھوپیں گے۔ قتل عمد کا کیس!'' ارشد نے کہا'' لیکن میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حادثہ تھا۔''

''نعیم رضوی اس طرح کے کیسز کا ماہر ہے۔ وہ تمہیں سزائے موت سے بہر

حال بچا لے گا۔''

''تو اسے فون کر کے اس سے بات کرو۔''

جعفر نے اپنے فون پر نعیم رضوی سے بات کر لی۔ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے'' لو...... میں نے تمہارا کام کر دیا۔'' اس نے ارشد سے کہا'' اب کام کی بات کرو۔''

''میری بدقسمتی ہی کہہ لو کہ جس وقت نازنین قتل ہوئی' میں اس کے گھر میں موجود تھا۔'' ارشد جمال نے کہا'' وہ اپنے زیورات کے معاملے میں اتنی بے پرواتھی کہ میرے لیے بہت بڑی ترغیب بن گئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ مختار گھر میں نہیں ہے اور وہ امتیاز کے ساتھ ڈنر پر جا رہی ہے۔ مجھے یہ بات عجیب لگتی تھی مگر سچ یہ ہے کہ وہ امتیاز پر بری طرح مرتی تھی۔''

''تو وہ تمہاری موجودگی کے دوران گھر میں تھا؟''

ارشد نے نفی میں سر ہلایا'' میرا خیال تھا کہ وہ سات بجے امتیاز کے پاس جائے گی لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ میں وہاں پہنچا تو نچلی منزل میں دھیمی روشنی تھی لیکن وہ معمول کے مطابق تھا۔ عقبی حصے میں' میں نے دیکھا۔ ماسٹر بیڈ روم کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میرے لیے اس کے ذریعے اندر داخل ہونا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔''

''وقت کیا ہوا تھا؟''

''ٹھیک آٹھ بجے تھے۔''

''تو تم مکان میں گھس گئے؟'' جعفر نے بات آگے بڑھائی۔

''ہاں۔ مکان میں خاموشی تھی۔ میں مطمئن تھا۔ میں نشست گاہ سے ہوتا ہوا دوسرے بیڈ روم میں گیا۔ وہاں نائٹ ٹیبل پر وہ تصویری فریم رکھا تھا۔ وہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت مجھے نازنین کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی پر چلا رہی تھی۔''

''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''مفہوم کچھ یوں تھا کہ یہ تم نے خود مجھے دیے ہیں۔ اس لیے اب میرے ہیں۔ اب تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تم سے اکتا چکی ہوں۔''

جعفر نے سوچا یہ یقیناً جیولری کی بات ہو رہی ہو گی "اس کا مطلب ہے کہ امتیاز حیدر وہاں موجود تھا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" "مجھے ایک مرد کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔" "مجھے یہ واپس چاہئیں؟ اور چیخنے کے باوجود وہ بہت مہذب آواز اور لہجہ تھا۔ امتیاز اس طرح بات نہیں کرتا اور مختار کی آواز بھی نہیں تھی۔" ارشد نے سرد آہ بھری "میں نے بہر حال اس مرحلے پر غیر ارادی طور پر اس فریم کو کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ نازنین کی تصویر جو اس فریم میں لگی تھی بہت حسین تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اب بھی خوشی ہوتی ہے۔ نازنین زندگی سے بھرپور عورت تھی۔ میں اب بھی اسے مس کرتا ہوں۔"

"تم کہہ رہے تھے کہ تم نے وہ فریم جیب میں ڈال لیا۔" جعفر نے اسے پھر پٹڑی پر ڈالا۔

"ہاں اور اسی وقت مجھے اوپر آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں تیزی سے الماری میں گھس گیا اور خود کو ملبوسات میں چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے الماری کا دروازہ پوری طرح بند نہیں کیا تھا۔"

"تو تم نے دیکھا کہ وہ کون تھا؟"

"نہیں۔ میں چہرہ نہیں دیکھ سکا۔"

"بہر حال آنے والے نے کیا کیا؟"

"وہ سیدھا جیولری باکس کی طرف گیا اور اس نے اس میں سے کچھ نکالا مگر شاید اسے کسی اور چیز کی تلاش تھی۔ وہ ایک ایک کر کے تمام درازیں کھکھوڑنے لگا۔ چند منٹ بعد یا تو اسے وہ چیز مل گئی یا پھر اس نے تلاش ترک کر دی۔ خوش قسمتی سے اس نے الماری کی طرف رخ نہیں کیا۔ میں وہیں دبکا کھڑا رہا مگر مجھے کسی بہت خوفناک گڑ بڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ اس شخص کے جانے کے بعد ذرا دیر بعد میں الماری سے نکلا اور نیچے آیا۔ تب میں نے نازنین کو دیکھا۔"

اس شخص نے جیولری باکس سے کون سا زیور لیا تھا؟"

"میرے خیال میں وہ پھول اور کلی کی شکل والی دہری پن تھی۔ بہت خوبصورت چیز تھی وہ۔"

"تو جس نے بھی نازنین کو وہ پن دی تھی تو اسی ڈیزائن کا بریسلیٹ بھی اس کا دیا ہوا ہو گا۔"

"ظاہر ہے اور مجھے یقین ہے وہ اس بریسلیٹ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ نازنین کو وہ پن اور بریسلیٹ کس نے دیا تھا؟"

"بالکل...... میں جانتا ہوں۔ نازنین مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاتی تھی لیکن میں حلفیہ نہیں کہہ سکتا کہ اس رات مکان میں وہی شخص تھا لیکن امکان یہی ہے کہ وہ ہو گا۔ میری گواہی اصل قاتل کی طرف اشارہ ضرور کر دے گی۔ اسی لیے میں خود کو رعایت کا مستحق سمجھتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے جعفر صاحب؟"

"مجھے بتاؤ۔ نازنین کو وہ پن اور بریسلیٹ دینے والا کون تھا۔" جعفر نے تیز لہجے میں کہا۔

ارشد مسکرایا "میں بتاؤں گا تو تم یقین نہیں کرو گے۔"

☆☆☆

سفینہ کو شاہ زیب کے گھر پہنچنے میں پچیس منٹ لگے۔ ڈرائیو کے دوران ہر لمحے وہ طوبیٰ کے بارے میں سوچتی رہی۔ میری بہادر بچی...... وہ ڈرتی بھی ہے تو اپنا خوف چھپانے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہ معاملہ ننھی سی بچی کی بساط سے بڑھ کر ہے۔ وہ آخر ٹوٹ گئی نا۔ ڈراؤنا خواب نہ دیکھتی تو اور کیا کرتی۔ مجھے اس کو کسی کے پاس نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اب...... اب میں کبھی اسے خود سے دور نہیں رکھوں گی۔ میں ہمیشہ اس کا خیال رکھوں گی۔ وہ پاگلوں کی طرح سوچے جا رہی تھی۔

ماں اور بیٹی...... اس کے ذہن میں پھر وہی الفاظ گونجے۔

اب وہ صرف چند منٹ کے فاصلے پر تھی!

طوبیٰ شاہ زیب کے ہاں جانے کا سن کر کتنی خوش ہوئی تھی۔ وہ خوش تھی کہ وہ البم دیکھے گی۔

فوٹو البم!

گاڑی شاہ زیب اکبر کے وسیع وعریض بنگلے کی حدود میں داخل ہوئی۔ اسے احساس ہوا کہ سنسر لائٹ آن نہیں ہوئی ہے۔

فوٹو البم!

پھول اور کلی کی شکل کی دہری پن!

وہ پن اس نے پہلے کہیں دیکھی تھی!

اچانک اسے یاد آ گیا۔ ویسی پن اس نے تمکنت کے پاس دیکھی تھی!

برسوں پہلے' جب وہ پہلی بار آئی تھی۔ اس وقت تمکنت آنٹی کو زیورات کا بہت شوق تھا۔ ہاں...... البم میں ان کی کئی تصویریں ہیں' جن میں وہ یہ پن لگائے ہوئے ہیں اور اس نے ایک بار اس پن کی بہت تعریف کی تھی تو تمکنت آنٹی نے مذاق میں کہا تھا...... ہاں یہ ماں بیٹی کی پن ہے۔ پھول ماں ہے اور کلی بیٹی۔

اور اس اخباری تصویر میں نازنین اپنے سویٹر پر تمکنت آنٹی کی پن جیسی پن لگائے ہوئے تھی! یا وہ آنٹی ہی کی پن تھی؟ تو اس کا مطلب......؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ زیب انکل...... ! کیا انہوں نے وہ پن نازنین کو دی ہو گی؟

اسے یاد تھا۔ تمکنت آنٹی نے بتایا تھا کہ انہوں نے اپنے تمام زیورات شاہ زیب انکل کو دے دیے ہیں کہ وہ انہیں بینک کے لاکر میں رکھوا دیں' "اب میں پہنتی نہیں ہوں پھر رکھنے کا کیا فائدہ؟ اور گھر میں اتنے زیورات رکھوں گی تو ان کی طرف سے پریشانی ہی رہے گی۔" انہوں نے کہا۔

اور گزشتہ رات وہ گھر آئی تو اس نے فون کر کے شاہ زیب انکل کو بتایا تھا کہ اس کے خیال میں ڈاکٹر سلمان کی مدافعت ٹوٹنے والی ہے۔ خدایا! تو کیا انکل نے ڈاکٹر کو شوٹ کیا ہو گا؟

اس نے گاڑی صدر دروازے کے سامنے روک دی۔ اس نے کار کا دروازہ بند کیا اور صدر دروازے کی سیڑھیوں پر لپکی۔ وہ پریشان تھی...... خوف زدہ تھی۔ طوبیٰ ایک قاتل کے پاس ہے' یہ خیال لرزا دینے والا تھا اس نے کار کے ٹیلی فون کو منقطع کرنے کی دھیمی سی آواز سنی۔ وہ تو اطلاعی گھنٹی کے بٹن کو دبا رہی تھی۔

☆☆☆

جعفر نے سفینہ کے گھر کا نمبر کئی بار ملایا لیکن فون نہیں اٹھایا گیا پھر اس نے اس کی کار کا فون نمبر ملایا لیکن وہاں بھی رابطہ نہیں ہوا۔ جعفر پریشان ہو گیا۔ اس کی

سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ سفینہ اس وقت کہاں ہے۔

پھر اس نے اظہر عباس کے دفتر کا نمبر ملایا۔ ایک مشینی آواز نے جواب دیا "پروسیکیوٹرز آفس بند ہو چکا ہے۔ اگر کوئی ایمرجنسی درپیش ہے تو پلیز یہ نمبر ڈائل کریں۔"

جعفر نے جلدی جلدی ایمرجنسی نمبر ڈائل کیا۔ طوبیٰ تو شاہ زیب کے گھر میں ہے لیکن سفینہ کہاں ہے۔ وہ متوحش ہو رہا تھا۔

بالآخر ایمرجنسی نمبر پر رابطہ ہو گیا۔

"میں وکیل جعفر سعید بول رہا ہوں۔" اس نے کہا "مجھے فوری طور پر اظہر عباس صاحب سے رابطہ کرنا ہے۔ اس کا تعلق قتل کے ایک کیس سے ہے۔ مجھے ان کے گھر کا نمبر دیجیے۔"

"وہ گھر نہیں ہیں۔ وہ ایک قتل کی واردات کے سلسلے میں مستانگ گئے ہیں۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔

"آپ کا ان سے رابطہ ہو سکتا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ ذرا ہولڈ کریں۔"

تین منٹ بعد اس نے اظہر عباس کی آواز سنی "جعفر...... میں بہت اہم معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

"بہت اہم بات ہے۔ نازنین مرڈر کیس سے متعلق سفینہ کی بیٹی طوبیٰ' آج رات شاہ زیب اکبر کے گھر میں ہے اور مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ نازنین کو وہ پن اور بریسلیٹ شاہ زیب اکبر نے دیا تھا۔ شاہ زیب کے نازنین سے تعلقات رہے تھے۔ میرا خیال ہے' اسی نے نازنین کو قتل کیا تھا اور اب طوبیٰ اس کے گھر میں ہے۔"

دوسری طرف طویل خاموشی رہی پھر اظہر نے غیر جذباتی انداز میں کہا "میں اس وقت ایک بوڑھے کاریگر کے مکان میں ہوں۔ وہ قدیم جیولر کی مرمت اور پالش کرنے کے سلسلے میں بہت مشہور تھا۔ آج شام اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ ڈکیتی کی واردات نہیں لگتی لیکن مقتول کے بیٹے کا کہنا ہے کہ اس کے باپ کا رجسٹر غائب ہے'

جس میں وہ اپنے گاہکوں کے ناموں کا اندراج کرتا تھا۔ اچھا سنو! میں پولیس کو شاہ زیب اکبر کے گھر بھیج رہا ہوں۔"

☆☆☆

دروازہ کھلا۔ اندر خاموشی تھی اور بہت مدھم روشنی۔

"وہ پرسکون ہوگئی ہے۔" شاہ زیب اکبر نے کہا "سب ٹھیک ہوگیا ہے۔"

سفینہ کے دونوں ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب میں تھے۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ وہ خوف اور غصے سے چھلک رہی تھی۔ تاہم اس نے خود پر قابو پایا اور مسکرائی

"مجھے افسوس ہے انکل۔ میں نے آپ کو اور آنٹی کو اتنی زحمت دی۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ طوبیٰ ضرور ڈرے گی۔ کہاں ہے وہ؟"

"اپنے کمرے میں اور گہری نیند سو رہی ہے۔"

سفینہ اس کے پیچھے پیچھے زینے پر چل دی۔ کیا میں پاگل ہوگئی ہوں؟ اس نے سوچا۔ میرا تخیل پتا نہیں کیا سمجھا رہا ہے مجھے۔ انکل تو بالکل نارمل ہیں۔

وہ گیسٹ روم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ طوبیٰ اسے گلابی گیسٹ روم کہتی تھی۔ کمرے کی دیواریں گلابی تھیں اور دروازوں پر پردے بھی گلابی تھے۔ سفینہ نے دروازہ کھولا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں طوبیٰ پہلو کے بل سوتی نظر آئی۔ اس کے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔

دو لمبے ڈگ بھر کر سفینہ اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے بچی کے رخسار چھوئے بچی کی سانسیں ہموار تھیں۔

اس نے نظریں اٹھا کر شاہ زیب انکل کو دیکھا...... وہ پائنتی کی طرف کھڑے اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ بہت اپ سیٹ تھی۔" شاہ زیب نے طوبیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم جب آئیں تو تم نے اسے گھر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ دیکھو......" انہوں نے ایک طرف رکھے ہوئے طوبیٰ کے بیگ کی طرف اشارہ کیا "اس میں اس کی کتابیں اور یونی فارم ہے۔ اب اسے میں لے جاؤں گا تمہاری طرف سے۔"

"انکل...... کیا اس نے کوئی ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا۔ یہ تو سکون سے سو

رہی ہے۔ یہ جاگی بھی نہیں۔ ہے نا؟" سفینہ کا لہجہ پرسکون تھا۔

"نہیں۔ یہ سکون سے سو رہی ہے۔" شاہ زیب نے بے پروائی سے کہا "اور اس کے لیے نہ جاگنا ہی بہتر ہے۔"

مدھم روشنی میں سفینہ کو ان کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آیا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آنٹی کہاں ہیں؟"

"تمکنت گہری نیند سو رہی ہے اور یہ بہتر ہی ہے۔ کبھی میں اس کے درد کو آرام دینے کے لیے اس کی چاکلیٹ میں خواب آور دوا ملا دیتا ہوں۔"

"آپ چاہتے کیا ہیں انکل؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم جس طرح زندگی گزار رہے ہیں، اسی طرح گزارتے رہیں۔ میں میئر کا معزز دوست رہنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی باقی زندگی اپنی بیوی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، جس سے میں سچ مچ محبت کرتا ہوں۔ دیکھو سفینہ، مرد کبھی کبھی بہک بھی جاتے ہیں۔ جوان اور خوب صورت عورتیں انہیں پھنسا لیتی ہیں۔ میں شاید تمکنت کی معذوری کی وجہ سے کمزور ہوگیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں حماقت کر رہا ہوں۔ میں اپنی غلطی کو سمجھ رہا تھا لیکن بعد میں صرف اپنی دی ہوئی جیولری واپس لینا چاہتا تھا۔ میں پاگل تھا کہ میں نے وہ زیورات اس چھچھوری بھڑکیلی عورت کو دیے اور وہ میری جیولری مجھے واپس دینے کو تیار نہیں تھی۔"

"لیکن انکل......"

شاہ زیب نے ریوالور لہرایا "اسے اٹھاؤ۔" انہوں نے طوبیٰ کی طرف اشارہ کیا "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟" سفینہ نے کہا۔

"وہی جو کرنا ہے۔ تاہم مجھے افسوس رہے گا اس کا۔ سفینہ...... تم اس کی ذمے دار ہو۔ تمہیں کیا ضرورت تھی اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی۔ وہ مختار عظیم جیل میں سڑ رہا تھا۔ سڑنے دیتیں اسے۔ تمہیں کیا فرق پڑتا تھا۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا کہ وہ بریسلیٹ اس نے اپنی بیٹی کو دیا تھا۔ میں تو محفوظ ہوگیا تھا۔ کسی کا کچھ نہ بگڑتا۔ میں اس شہر کی خدمت کرتا رہتا اور اپنی بیوی کے ساتھ خوش رہتا۔ مجھے

دونوں سے بہت محبت ہے۔ اپنے شہر سے بھی اور اپنی بیوی سے بھی۔ میرے لیے یہ سزا ہی کافی تھی کہ تمکنت میری بے وفائی سے آگاہ ہے۔'' وہ مسکرائے ''تمکنت بہت شان دار عورت ہے۔ اس نے اخبار میں چھپی نازنین کی تصویر مجھے دکھائی اور بولی۔ اس پن کو دیکھ کر تمہیں میری پھول اور کلی والی پن یاد نہیں آتی۔ اب تو میرا دل دوبارہ اسے لگانے کو چاہتا ہے۔ اسے لاکر سے نکال کر لانا ڈیئر۔ وہ جانتی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ جانتی ہے۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں گندگی میں لتھڑ گیا ہوں۔''

''اور آپ نے نازنین کو قتل کر دیا؟''

''اس نے نہ صرف مجھے میری بیوی کے زیورات دینے سے انکار کیا۔ اس کا حوصلہ تو دیکھو اس نے مجھے بتایا کہ اب وہ امتیاز حیدر کی بانہوں میں رہنا چاہتی ہے۔ وہ بدمعاش' لفنگا' ٹھگ ...... خدا کی پناہ!''

''ممی۔'' طوبیٰ کسمسا رہی تھی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ''مما......'' وہ مسکرائی ''آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔''

''اٹھو گڑیا' ہمیں جانا ہے۔'' سفینہ نے کہا اور سوچا کہ یہ شخص جو میرے لیے باپ جیسا تھا' ہم دونوں کو قتل کر دے گا۔ اس نے طوبیٰ کو لپٹا لیا۔

طوبیٰ کو کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں ماں سے لپٹ گئی۔ ''ممی ...... کیا بات ہے؟''

''سب ٹھیک ہے بیٹا۔'' سفینہ نے اسے دلاسا دیا۔

''نانا......؟'' طوبیٰ کی نظر ریوالور پر پڑ گئی تھی۔

''کچھ مت کہو طوبیٰ۔'' سفینہ نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ انکل کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ اپنے کنٹرول میں نہیں ہیں۔ کاش جعفر' ارشد سے ملنے شام گھر نہ گیا ہوتا۔ وہ ہماری مدد کر سکتا تھا۔ وہ ہر حال میں ہماری مدد کرتا۔

اب وہ سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔ شاہ زیب نے سرد لہجے میں کہا ''اپنی کار کی چابی مجھے دے دو۔ میں تمہارے پیچھے نکلوں گا اور تمہیں اور طوبیٰ کو ڈکی میں

بیٹھنا ہوگا۔''

خدایا! سفینہ نے سوچا۔ یہ ہمیں قتل کریں گے اور کار کہیں لے جاکر چھوڑ دیں گے۔ اسٹائل کی وجہ سے سب کا دھیان امتیاز حیدر کی طرف جائے گا۔

اب وہ ہال سے گزر کر صدر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہ زیب نے کہا ''مجھے بہت افسوس ہے طوبیٰ گڑیا۔ اچھا سفینہ اب بڑی آہستگی سے دروازہ کھولو۔ شاباش۔''

سفینہ یوں جھکی' جیسے طوبیٰ کو پیار کرنا چاہ رہی ہو۔ ''طوبیٰ جیسے ہی میں گھوموں' تم بھاگ لینا۔'' اس نے سرگوشی میں بچی سے کہا ''بھاگنا اور زور سے چیختی رہنا۔''

''دروازہ کھولو سفینہ۔'' شاہ زیب نے اسے ٹھوکا دیا۔

سفینہ نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ شاہ زیب نے پورچ کی لائٹ آف کر رکھی تھی۔ روشنی دور ڈرائیو وے کی طرف سے آ رہی تھی اور بہت مدھم تھی۔ ''چابی میرے کوٹ کی جیب میں ہے۔'' سفینہ نے کہا پھر وہ پلٹی اور چلائی ''بھاگو طوبیٰ۔'' اور اس کے ساتھ ہی وہ شاہ زیب پر جھپٹی۔ ریوالور سے گولی چلی۔ وہ شاہ زیب سے لپٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنی کنپٹی کے پاس تکلیف کا احساس ہوا اور وہ چکرا سی گئی۔ اسے لگا کہ ہال کا ماربل کا فرش اس کی طرف لپک رہا ہے اور اسے ہر طرف سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر گولی چلنے کی ایک اور آواز آئی۔ طوبیٰ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اس کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اسے سائرنوں کی قریب آتی آواز سنائی دی۔

اچانک اس نے تمکنت کی شکستہ آواز سنی ''مجھے افسوس ہے زیب۔ میں تمہیں یہ نہیں کرنے دے سکتی ...... سفینہ اور طوبیٰ کے ساتھ ہرگز نہیں۔''

سفینہ اٹھی۔ اس نے اپنی کنپٹی کو چھو کر دیکھا۔ خون بہتا ہوا اس کے چہرے پر آ گیا تھا لیکن چکر تھم رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تمکنت اپنی وہیل چیئر سے فرش پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان کی متورم انگلیوں سے ریوالور نکل گیا تھا اور انہوں نے اپنے شوہر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

منگل۔ 6 فروری!

عدالت کا کمرا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ حلف برداری کی تقریب تھی۔ اسسٹنٹ پروسیکیوٹر سفینہ انصار جج کی حیثیت سے حلف اٹھا رہی تھی۔ لبادہ پہنے ہوئے ججوں کی قطار کمرے میں داخل ہوئی تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ جج اپنے نئی کولیگ کو خوش آمدید کہنے کے لیے آ رہے تھے۔

سفینہ نے مہمانوں کا جائزہ لیا۔ اس کی امی اور سوتیلے والد اس تقریب میں شرکت کے لیے خاص طور پر آئے ہوئے تھے۔ طوبیٰ ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب کوئی نشان نہیں تھا ...... وہ نشان جن کی وجہ سے وہ ڈاکٹر سلمان احسن تک پہنچے تھے۔

دوسری طرف جعفر سعید اپنی ماں اور باپ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سفینہ کو یاد آیا کہ وہ ہسپتال میں اسے دیکھنے کے لیے آیا تو کتنا پریشان تھا اور طوبیٰ کو اسی نے سنبھالا تھا ورنہ طوبیٰ کی کیفیت تو ہسٹریائی تھی اور سفینہ کو ہسپتال میں رکنا پڑا تو وہ طوبیٰ کو اپنے گھر، اپنے والدین کے پاس لے گیا تھا۔

اب اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں محبت دیکھ کر سفینہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ جعفر اسے دیکھ کر مسکرایا۔

سفینہ کو تمکنت اور شاہ زیب اکبر کا خیال آ گیا۔ تمکنت نے اسے مختصر سا خط بھیجا تھا ......

بیٹی سفینہ۔

میں یہ شہر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ اب ارادہ ہے کہ اپنی بہن کے ساتھ رہوں گی۔ وہ ارشاد آباد میں رہتی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، میں اس کے لیے خود کو مورد الزام ٹھہراتی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ شاہ زیب اس عورت کے دام الفت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ یہ زیادہ دیر چلنے والی بات نہیں۔ اگر میں نے اخبار میں چھپنے والی اس تصویر کو نظر انداز کر دیا ہوتا، جس میں وہ نازنین میرا پن لگائے ہوئے تھی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میں کم ظرف ثابت ہوئی۔ مجھے زیورات کی ایسی کوئی پروا

نہیں تھی۔ میں نے شاہ زیب کو یہ سوچ کر ٹوکا تھا کہ اس طرح وہ اس عورت کو چھوڑ دے گا۔ میری بیٹی! ہو سکے تو مجھے اور شاہ زیب کو معاف کر دینا۔

دعائیں۔ تمکنت اکبر!

کیا میں انہیں معاف کر سکتی ہوں؟ سفینہ نے سوچا۔ تمکنت آنٹی نے تو میری زندگی بچائی لیکن شاہ زیب انکل تو خود کو بچانے کے لیے مجھے اور طوبیٰ کو ختم کر دینا چاہتے تھے اور آنٹی شاید جانتی تھیں کہ نازنین کو انکل نے ہی قتل کیا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے بے قصور مختار کو اتنے برسوں جیل میں سڑنے دیا۔ یہ انسانیت تو نہیں عالی ظرفی تو نہیں۔

مختار، صدیقہ بیگم اور بتول بھی اس تقریب میں آئے ہوئے تھے۔ مختار اور بتول کی اگلے ہفتے شادی ہونے والی تھی اور اس کے چند روز بعد سفینہ اور جعفر کی شادی ہوتی۔

حلف برداری کی تقریب سے پہلے روایت کے مطابق کچھ لوگوں کو مختصر خطاب کرنا تھا۔ سب سے پہلے اظہر عباس نے خطاب کیا ”میں اپنی یادداشت کو کھنگالتا ہوں مگر مجھے کوئی مرد، کوئی عورت یاد نہیں آتی جو سفینہ انصار سے بڑھ کر جج کے عہدے کی مستحق ہو۔ ان کی انصاف پسندی نے انہیں مجھ سے التجا کرنے پر مجبور کر دیا کہ میں دس برس پرانا کیس ری اوپن کروں۔ یوں ہم دونوں نے مل کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ اس تلخ حقیقت کا سامنا کیا کہ ایک منتقم مزاج باپ نے اپنے داماد کو سزا دلوا دی ...... دانستہ جھوٹی حلفیہ گواہی کے زور پر۔ جبکہ اس کی بیٹی کا قاتل آزاد گھومتا رہا لیکن ہم نے بالآخر انصاف کو سربلند کر دیا۔“

واہ ...... سفینہ نے سوچا۔ یہ ہے سیاست۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ لفظ ”ہم“ میں کتنی طاقت ہے۔ کہاں تو میری تقرری خطرے میں پڑ گئی تھی مگر بہر حال یہ حقیقت تھی کہ آخر میں اظہر نے پوری طرح اس کا ساتھ دیا تھا اور اس نے خود گورنر سے اس کی تقرری کے لیے اصرار کیا تھا۔

اور نازنین کیس سے امتیاز حیدر کو بھی اظہر نے ہی کلیئر کیا تھا۔ امتیاز کے ایک ساتھی نے پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ یہ سچ ہے کہ نازنین اور امتیاز

کے درمیان چکر چل رہا تھا اور امتیاز نے نازنین کو قیمتی زیورات خرید کر دیے تھے۔ اس نے اس رات نازنین کو پھول بھی بھجوائے تھے۔ اس رات نازنین اس سے ڈنر پر ملنے والی بھی تھی۔ جب نازنین وعدے کے مطابق پہنچی تو امتیاز غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے خوب پی اور پھر قسم کھائی کہ وہ نازنین کو قتل کردے گا۔

امتیاز حیدر ایسا آدمی نہیں تھا' جو خواہ مخواہ قسم کھاتا ہو۔ وہ جو کہتا تھا' کرتا بھی تھا۔ اس لیے اس کے قریبی ساتھیوں کو اس بات کا یقین تھا کہ اس نے ہی نازنین کو قتل کیا ہے۔ خود امتیاز ڈرتا تھا کہ اگر اس کا اور نازنین کا تعلق زیر بحث آیا تو اسے ہی قاتل سمجھا جائے گا۔

اب ایک جج خطاب کررہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ''میں نے دس سال پہلے سفینہ انصار کو پہلی بار عدالت میں دیکھا تو وہ ایک نو آموز اسسٹنٹ پروسیکیوٹر کی حیثیت سے آئی تھیں اور وہ اتنی کم عمر تھیں کہ میں انہیں کالج کی اسٹوڈنٹ سمجھا تھا......''

میں اس وقت نو آموز دلہن بھی تھی۔ سفینہ نے تلخی سے سوچا۔ وقاص مرزا بھی اس وقت اسسٹنٹ پروسیکیوٹر تھا۔ کاش اس کے پاس عقل بھی ہوتی اور وہ امتیاز حیدر اور ریحان جعفری جیسے لوگوں سے دور رہا ہوتا۔ اب امتیاز حیدر بری طرح پھنس چکا ہے اور اب اس پر سرکاری ملازمین کو رشوت دینے کے سلسلے میں بھی کیس چلنے والا ہے۔ اس کیس میں خود وقاص ...... بھی ملوث ہوتے ہوتے بچا ہے۔ کاش اب اسے عقل آجائے۔

اور پھر حلف برداری کا وقت آگیا۔ اس کا نام پکارا گیا اور وہ چیف جسٹس کے پاس گئی۔ چند لمحے بعد وہ کہہ رہی تھی ''میں' سفینہ انصار......''

ختم شد